JAWAHARLAL NEHRU UNIVERSITY

CENTRE OF INDIAN LANGUAGES
SCHOOL OF LANGUAGES

Gram—JAYENU
Telephone :
New Mehrauli Road,
NEW DELHI-110067.

Certified that the material in this dissertation entitled " Taqseem-i-Hind Ke Baad Urdu Afsaane Ke Mauzu'aat", submitted by Mehnaz Khatoon Siddiqui, has not been previously submitted for any other degree of this or any other University.

For (Mohammad Hasan)
Professor & Chairman
Centre of Indian Languages
SL, JNU, New Delhi-67

(S.R. Kidwai)
Supervisor
&
Associate Professor,
CIL, SL, JNU, New Delhi-67

تقسیم ہند کے بعد اردو افسانے کے موضوعات

تحقیقی مقالہ

(ایم۔فل۔کورس)

۱۹۷۸-۷۹

مہناز خاتون صدیقی

نگراں:۔ ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی

ہندوستانی زبانوں کا مرکز

جواہر لال نہرو یونیورسٹی

نئی دہلی

تقسیم ہند کے بعد اردو افسانوں کے موضوعات

تحقیقی مقالہ

(ایم۔فل کورس)

۱۹۷۸ ـ ۷۹ء

از : مہناز خاتون صدیقی

نگراں : ڈاکٹر صدیق الرحمن قدوائی

ہندوستانی زبانوں کا مرکز ،

جواہرلال نہرو یونی ورسٹی ،

نئی دہلی ـ ۱۱۰۰۶۷

فہرست مضامین

حرفِ آغاز ..... الف ـــ د

پہلا باب : تقسیم ہند اور فسادات ۱ ـــ ۱۰

کھولدو ـــــ لاجونتی ـــــ شکر گزار آنکھیں ـــــ ماں بیٹا ـــــ
آخری کوشش ـــــ جلا وطن ـــــ جڑیں ـــــ

دوسرا باب : اُردو افسانہ تقسیم ہند کے بعد ۱۱ ـــ ۲۱

جنس ـــــ انسان دوستی ـــــ گھریلو معاشرہ ـــــ
قحط بنگال ـــــ رومانوی اثر ـــــ زندگی کی چھوش
چھوش مسرتیں ـــــ دو رخا سماج ـــــ شہری زندگی
کی عکاسی ـــــ صنعتی نظام ـــــ انسان دوستی ـــــ
مغربی معاشرہ کا اثر ہندوستانی زندگی پر ـــــ

تیسرا باب : موضوعات کی تبدیلی ۱۹۵۰ء کے بعد ۲۲ ـــ ۱۲۹

اقتصادی پریشانیاں ـــــ روزگار کا مسئلہ ـــــ انسان کا
کھوکھلا پن ـــــ حکومت کی کاؤں کی طرف سے بے توجہی ـــ
ـــ برائی ، سماج کی دین ـــــ انسان دوستی ـــــ
انسان کا تصورات سے رشتہ ـــــ معاشرہ کی تباہ کاریاں ـــــ
دو انسانوں کی سوچ کا فرق ـــــ انسانی خواہشوں کی تکمیل ـــ
ـــــ مذہبی عقیدے ـــــ کثرت اولاد ، ایک شرم ناک مسئلہ ـــ
ازدواجی نا آسودگی ـــــ شہری انسان کی چھپی ہوئی ضرورتیں ـــ

شہری زندگی اور اس کے فرائض ـــ سماج کی بدلتی ہوئی
قدریں ـــ نئی نسل کے مسائل ـــ فربت ایک گناہ ـــ
ـــ وطن پرستی ـــ عورت کی نفسیات ـــ جنس
ایک سودا ـــ عورت کی ثابت قدمی ـــ جنس، ایک
سانپ کی شکل میں ـــ ملازمت کا نہ ملنا ـــ حیدرآبادی
جاگیردارانہ تمدن کا زوال ـــ جنس ـــ گھریلو معاشرے
کی عکاسی ـــ عشق محبت کی ناکامی ـــ یو۔پی کا
زمیندارانہ تہذیب کا زوال ـــ صنعتی ترقی اور نیا کسان ـــ
ـــ شہری زندگی اور کسان ـــ نئے معمار ـــــــ

علامتی افسانہ (موضوعات کی روشنی میں) ۱۵۰ ـــ ۱۲۹

سماجی نظام جمود کا شکار ـــ تنگ دست انسان اور اچھی
زندگی کا معیار ـــ رشتوں پر سماجی حقوق ـــ خود کو
نہ پہچاننے کا المیہ ـــ روشنی کی تلاش ـــــــ

نتائج : ..... ۱۷۰ ـــ ۱۷۱

کتابیات: ..... ۱۷۲ ـــ ۱۷۵

حرفِ آغاز

تقسیم ہند کے بعد اردو افسانے کے موضوعات میں اضافے ہوئے ہیں اور پرانے موضوعات کو نئے زاویوں سے دیکھ کر بالکل نئی تصویریں پائی گئی ہیں ۔مقالے میں ان ہی موضوعات کا مطالع و تجزیہ کیا گیا ہے ۔تنقیدی مضامین اور کتابوں میں اس کے متعلق اشارے بکھرے ہوئے ملتے ہیں ۔رسائل میں افسانوں کی تکنک اور کردار نگاری سے متعلق بہت بحث ہوئی ہے ۔افسانے کی مختصر تاریخ اکثر دہرائی گئی ہے ۔کسی خاص افسانہنگار کے فن سے بحث کی گئی ہے ۔لیکن تقسیم ہند کے بعد وہ کون سے ایسے موضوعات ہیں جن سے افسانہ نگار متاثر ہوئے ہیں ۔ان پر کوئی تحقیقی کام نہیں ملتا ہے ۔۔۔

وقار عظیم کی کتاب " داستان سے افسانے تک" میں افسانے کی ابتدا سے تقسیم کے بعد تک کے افسانہ نگاروں کو زیر بحث لایا گیا ہے ۔ " افسانہ نگاروں کی نئی پود " کے عنوان سے انہوں نے نئے افسانہ نگاروں کی فہرست کے ساتھ ساتھ انکے کچھ رجحانات سے بھی بحث کی ہے لیکن موضوعات سے کوئی بحث نہیں ۔۔۔یہی حال " نیا افسانہ" کے جائزے سے ہوتا ہے ۔ " افسانہ تقسیم کے بعد " کے عنوان سے انہوں نے افسانہ نگاروں کے نئے تجزیہ اور رجحانات پر تبصرہ کیا ہے ۔لیکن ۱۹۵۰ء کے بعد اردو افسانے کی دنیا میں جو افسانے نگار آئے ان کے افسانوں کے موضوعات سے باقاعدہ بحث نہیں ملتی ۔ تنقیدی مضامین کے مجموعوں میں ۔آل احمد سرور ۔سید احتشام حسین ۔ پروفیسر محمد حسن ۔

ڈاکٹر قمر رئیس کے مضامین ۱۹۵۰ء کے بعد اردو افسانے کی صورت حال نئے رجحانات کو سمجھنے میں مدد گار ثابت ہوتے ہیں ۔۔۔

پہلا عنوان ہے " تقسیم ہند اور فسادات"

اس عنوان کے تحت تقسیم کا المیہ ایک سیلاب کی طرح آیا اور اسکی تباہیوں کو مخصوص افسانہ نگاروں نے جس طرح اپنے افسانوں میں پیش کیا ان افسانوں کے ساتھ ان موضوعات سے بحث کی گئی ہے ۔یہ ایک ایسا موضوع ہے جسے وقت اور زمانہ کی گرفت میں نہیں لایا جاسکتا کیوں کہ یہ موضوع ابھی تک کسی نہ کسی شکل میں دہرایا جارہا ہے ۔اس عنوان کے تحت اس وقت کے افسانے زیر بحث ہیں جب یہ موضوعات تازہ تھے ۔اس مقالے میں چونکہ پاکستانی افسانے اور افسانہ نگار زیر بحث نہیں ہیں اس لئے بعض اہم افسانہ نگاروں اور افسانوں کو بادل ناخواستہ انداز کیا گیا ہے ۔

دوسرا عنوان ہے " تقسیم سے پہلے کے افسانہ نگار تقسیم ہند کے بعد "

اس حصہ میں وہ افسانہ نگار زیر بحث رہے ہیں جنھوں نے آزادی کی جنگ میں لڑی اور تقسیم کا المیہ بھی دیکھا ۔یہ ایسے افسانہ نگار ہیں جو تقسیم سے پہلے افسانہ کی تاریخ میں نمایاں مقام حاصل کرچکے تھے اور تقسیم کے بعد بھی لکھتے رہے ۔تقسیم کے بعد انکے یہاں جن تبدیلیوں کا احساس ہوا ان پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے ۔

تیسرا اور سب سے اہم عنوان " موضوعات کی تبدیلی ۱۹۵۰ء کے بعد " ہے ۔

۱۹۵۰ء کے بعد ہندوستان میں طرح طرح کی تبدیلیوں کا احساس ہوا ۔ صنعتی ، معاشی اور تہذیبی تبدیلیاں رونما ہوئیں ۔ زمینداری ختم ہوئی لیکن سرمایہ داری نظام کی نشو نما ہوئی ۔بڑے بڑے کارخانے وجود میں آئے جس سے مشترکہ خاندان کا شیرازہ بکھرا ۔گاؤں کے لوگوں نے شہروں کا رخ کیا ۔بیکاری عام ہوئی ۔ مل مالک کے

جھگڑے کھڑے ہوئے ۔پنج سالہ منصوبے بنے۔ا غیرملکی امداد حاصل کی گئی ۔جس سے اگر ایک طرف ملک صنعتی طور پر ترقی کے نئے راستوں پر گامزن ہوا تو ساتھ ہی انسانی زندگی کے نئے مسائل سر اٹھانے لگے ۔ دیہات کے لوگوں کے بچے شہروں میں تعلیم پانے لگے اور شہری زندگی کو ہی ترجیح دینے لگے ۔شہر کی ہنگامی زندگی ۔ ہوٹل کلب اور عورت کا حسن اسے اپنی طرف کھینچنے لگا جس سے اسکی اپنی زندگی کا سکون جاتا رہا ۔دفتر کی نوکری میں افسر اور کلرک کی آپسی رنجش فرد کے ذہن کو بوجھل کرنے لگی ـــــــضروریات دن بدن بڑھتی گئیں اور آمدنی کم ہوتی گئی جسکا نتیجہ سود خوری ۔رشوت اور لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہوا ۔انسانی رشتے پیچیدہ ہوتے گئے اور کارخانے مشین اور انسان کا تعلق ان رشتوں کو پیچیدہ کرنے لگا ۔بڑے بڑے شہروں میں کارخانوں کی تعداد بڑھنے لگی ۔ہڑتال اور تالہ بندی نے مزدوروں کی زندگیاں اگر ایک طرف دشوار کردیں تو ساتھ ہی ان میں اب ظلم کے خلاف سر اٹھانے کی ہمت پیدا ہوئی ـــــــدیہاتوں کی ترقی پر بھی غور کیا گیا مگر دیہات کی اصلاحی کاروائی میں۔ پروپیگنڈہ زیادہ اور کام کم ہوا ـــ بڑے بڑے قصبات میں زمینداری کے ختم ہونے سے بھیانک اسباب دیکھنے کو ملے ایک عام مثال ہے رسی جل گئی اینٹھن نہ گئی ۔ انکی زمیندارانہ شاہانہ بات تو ختم ہو گئے مگر اب بھی ان کھوکھلی زندگیوں میں انکے زمانہ کی شان جھلکتی نظر آتی ہے ـــ

مذکورہ بالا تمام سماجی تبدیلیوں کو ۵۰ کے بعد کے افسانوں میں دیکھا جاسکتا ہے ۔سماج کے ڈھانچہ میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں انسان کی زندگی میں جو تبدیلیاں آئیں ۔افسانہ نگاروں نے انہی تبدیلیوں کو اپنے افسانہ کا موضوع بنایا ـــ

مذکورہ بالا عنوان میں انہی موضوعات سے بحث کی گئی ہے ـــــــ ساتھ ہی ایسے افسانے نگار بھی شامل ہیں جنھوں نے سماج میں فرد کی اندرونی گھٹن کو علامتی طور پر پیش کیا ہے ۔ ایسے افسانہ نگاروں کے یہاں اسلوب اور تکنک کے نئے تجزیے ملتے ہیں جنھیں اس مطالع میں پیش نظر رکھا گیا ہے ۔

۱۹۵۰ء کے بعد بھی افسانہ نگاروں کی فہرست میں خاصہ اضافہ ہوا ۔ جن میں سے چند نمایاں مصنفوں کے افسانوں کے موضوعات کا جائزہ لیا گیا ہے ۔

ـــــ ××× ـــــ

تقسیم ہند ـــــــ فسادات ، اردو افسانہ کا موضوع

۱۹۴۷ء تک ترقی پسند تحریک کے ذریعہ افسانہ نگاروں کی کوششیں اپنے ملک کی بدحالی اور گھٹن کو دور کرکے آزادی کی سانسیں لینا تھیں ۔ایک طویل مدت کے بعد انہیں اس میں کامیابی مل گئی مگر ساتھ ہی ملک کی دو حصوں میں تقسیم دوبارہ انتشار ، بے چینی مجبوری و بے کسی کا ماحول پیدا کردیتی ہے۔ آزادی کی خوشی تقسیم کے المیے کے آگے ماند پڑ جاتی ہے ۔جذبئہ آزادی سے لوگوں کے دل اچھی طرح سرشار ہی نہ ہوئے تھے کہ ملک کے دو ٹکڑوں نے اچانک دلوں کو خوں سے بوجھل کردیا ۔ایک طرف قتل و خون ہوا ، بستیاں کی بستیاں ویران ہو گئیں ۔پورے پورے خاندان فسادات کا شکار ہوئے ۔نہ صرف دو ملکوں کا بٹوارہ ہوا بلکہ ذہنوں اور دلوں کا بھی بٹوارہ ہوا ۔تمام قدریں بکھر گئیں ۔ رشتے ٹوٹ گئے اور خود انسانیت کا دم گھٹنے لگا ۔بٹوارہ کی آگ میں لوچ کھسوٹ کا بازار گرم ہوا ۔ایسے حالات میں کیسے ممکن تھا کہ ادب جو کہ ہمیشہ سے اپنے زمانہ ، دور اور حالات کا آئنہ ہے اپنے اندر اس کرب و بے چینی کو نہ سمیٹ لے۔ چنانچہ اس دور کا ہر ادیب انہیں حالات سے متاثر ہوکر قلم اٹھاتا ہے ۔یہاں تک اس زمانہ کی غزل بھی غم جاناں کو بھول کر غم دوراں میں سیاسی و سماجی حالات

کے ارد گرد بھٹکنے لگتی ہے -

ملک تقسیم ہو گیا ——— مختصر افسانے کو نئے نئے موضوعات وپلاٹ ملنے لگے ——— ملک جب تقسیم ہوا اس وقت ہندوستان میں ایسے لکھنے والوں کی تعداد اچھی خاصی تھی جنھوں نے تقسیم سے پہلے اردو افسانے میں اپنا نمایاں نام پیدا کر دیا تھا ——— اور تقسیم کے بعد بھی انھوں نے کثرت سے افسانے لکھے - تقسیم کے موضوع پر — اس سے پیدا ہونے والے واقعات و حالات پر — فرقہ وارانہ فسادات پر — دو ملکوں میں بٹے ہوئے خاندانوں پر ——— ہندو مسلم بھائی چارگی پر ——— دونوں کی آپس میں نفرت پر — کشت و خون — عادت گری اور لوٹ کھسوٹ پر ——— غرض کہ ملک ایک انتشار سے دوچار تھا اور افسانہ نگار اس کو اپنی فنکارانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا -

اردو افسانہ نگاروں نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ اس دور کی تصویر کشی کی ہے ——— اس زمانہ کے حالات - واقعات اور نفسیاتی کیفیات کا تجزیہ کیا ہے - بعض افسانہ نگاروں کا موضوع ایک ایسا ماحول اور معاشرہ ہے جس سے وہ بچھڑ گئے تھے اور اب صرف ان کے دلوں میں اچھے دنوں کی یادیں رہ گئی تھیں - تصور کی انگنائی میں خیال کی لہر ہولے سے دوڑتی اور افسانہ نگار اسے کسی مقنا طیسی کشش کے سہارے اوراق کی تہوں میں لپیٹ دیتا اور بعض نے ہندو پاک میں تقسیم کی بنا پر پیدا ہونے والے بے شمار سماجی سیاسی اقتصادی اور نفسیاتی مسائل کو افسانوں کا موضوع بنایا - تقسیم ہند کے بعد اردو افسانے کی ترقی میں خاصہ اضافہ ہوا - پہلے یعنی تقسیم وطن اور آزادی سے قبل بھی اردو افسانہ فن کی

اس منزل پر پہنچ گیا تھا جہاں زندگی کے حقائق فنکار کی شخصیت اور فن کا حسن ایک دوسرے میں جذب اور مدغم ہو جاتے ہیں ۔اس دور کے افسانہ نگاروں نے اپنی تخلیقات میں اس بات کی کوشش کی کہ افسانہ اور زندگی کی حقیقتوں میں گہرا ربط ہونا چاہئے —

تقسیم ہند کے بعد کافی مدت تک افسانے میں فسادات اور اس سے پیدا ہونے والی دوسری بدحالیاں ہی دہرائی جاتی رہی ہیں — اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد حسن نے بڑی اہم بات کہی ہے —

"اردو افسانہ مدتوں تک دو باتیں نہیں بھولا ایک
تقسیم وطن اور دوسرا جاگیردارانہ تہذیب کا
زوال — " ۱

تقسیم وطن پر انگنت افسانے لکھے گئے ۔جن میں خصوصاً منٹو کے افسانے " ٹوبہ ٹیک سنگھ " "کھول دو" اور "ٹھنڈا گوشت"۔ بیدی کا شاہکار افسانہ " لاجونتی " حیات اللہ انصاری کے افسانے " ماں بیٹا " اور " شکرگزار آنکھیں" ۔ احمد ندیم قاسمی کا " پرمیشر سنگھ" قرت العین کا افسانہ " جلا وطن " اور عصمت چغتائی کا " جڑیں" اہم ہیں —

فسادات سے متعلق لکھے گئے ان افسانوں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح انسان مذہب اور انسانیت سے بے بہرہ ہوکر بے گناہوں کو بھی ظالم و سفاک

۱۔ ڈاکٹر محمد حسن ، ساتویں دہائی کا افسانہ ، عصری ادب ، دسمبر ۱۹۷۰ء ص ۱۲۹

ہاتھوں سے قتل کر رہے تھے ۔کرشن چند کے افسانے نے " امرت سر آزادی سے پہلے " "امرت سر آزادی کے بعد " پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ انسان انسانیت سے کس قدر دور جا چکا تھا ۔منٹو نے " نمبر دو کی خدائی " لکھ کر ظاہر کیا کہ مذہبی تعصب کتنا بڑھ چکا تھا فسادات کے درمیان نہ صرف ہندو مسلمان کے درمیان نفرت کی آگ بھڑک رہی تھی بلکہ لوگ ظلم سے اندھے ہوکر بغیر سوچے سمجھے قتل و خون کر رہے تھے — اور جیسا کہ منٹو نے اپنے افسانے " سہائے " میں ظاہر کیا ہے۔ افسانہ کی شروعات اس طرح ہوتی ہے —

" یہ مت کہو ایک لاکھ ہندو یا ایک لاکھ مسلمان مرے ہیں ۔
یہ کہو کہ دو لاکھ انسان مرے ہیں ۔"[۱]

یہ انسان کی تمیز تو ایک باشعور انسان کرسکتا ہے مگر اس وقت تو ہر انسان پاگل تھا جس میں خود اپنے مذہب اور اپنی قوم کا احساس نہیں رہا تھا ۔ یہ سب کچھ پاگل پن تھا اور انہی وحشیانہ حرکتوں کو منٹو نے "ٹو بہ ٹیک سنگھ" افسانہ لکھ کر ظاہر کیا ہے —لوگوں میں اتنی بھی تمیز نہ تھی کہ پاکستان اور ہندوستان میں فرق کیا ہے ؟ دونوں کی حدود کیا ہیں ؟ ———پاگل خانے کا ایک پاگل محمد علی تھا جس نے خود اعلان کردیا تھا کہ وہ قائد اعظم محمد علی جناح ہے ۔اور اس کو دیکھ کر ایک سکھ پاگل اپنے آپ کو ماسٹر تارا سنگھ کہ دیتا ہے — دونوں کے خون خرابہ سے پہلے ہی دونوں کو الگ الگ جیل میں بند کردیا گیا ———لیکن پاکستان اور ہندوستان کے مسئلہ کو اٹھانے والے پاگلوں پر قابو نہ پایا جاسکا —

۱۔ سہائے ، سعادت حسن منٹو ، منٹو نمبر ، روبی ، دہلی ۔ ستمبر / ۱۹۷۷۔ ص ۷۵

" کھول دو " کا موضوع بھی فسادات سے لیا گیا ہے جس میں ایک باپ سے اس کی نیک سیرت بیٹی سکینہ جدا ہوجاتی ہے اور گھر بار لٹ جاتا ہے ۔ بیوی مرجاتی ہے وہ بیوی کی لاش دیکھتا ہوا بیٹی کی تلاش میں پاگل ہو رہا تھا ۔ اسے نوجوانوں کا ایک گروہ ملتا ہے جن سے وہ سکینہ کی شناخت بتاتا ہے اور وہ اسے یقین دلاتے ہیں کہ وہ ضرور ڈھونڈ لائیں گے ۔ان نوجوانوں کو سکینہ ملتی ضرور ہے مگر وہ باپ کو اس وقت ملی جبکہ چار آدمیوں کے ذریعہ اسے ہسپتال لے جایا جا رہا تھا ۔ افسانے کا خاتمہ اتنے عبرتناک انداز میں ہوا ہے کہ قاری ایک دم چونک جاتا ہے ۔ افسانے کا آخری جملہ " کھڑکی کھول دو " میں افسانہ نگار نے بہت کچھ کہہ دیا ہے —

" ڈاکٹر نے جس نے کمرے میں روشنی کی تھی ۔

سراج الدین سے پوچھا کیا ہے ؟

سراج الدین کے حلق سے صرف اتنا نکل سکا ۔

جی —میں اس کا باپ ہوں ۔

ڈاکٹر نے اسٹریچر پر پڑی ہوئی لاش کو دیکھا اور اس کی بنض ٹٹولی اور سراج الدین سے کہا ——

" کھڑکی کھول دو "

سکینہ کے مردہ جسم میں جنبش ہوئی ۔بے جان ہاتھوں سے اس نے ازار بند کھولا اور شلوار نیچے سرکادی ۔"

بوڑھا سراج الدین خوشی سے چلایا ۔زندہ ہے میری بیٹی زندہ ہے —" [1]

وہ باپ جو کہ بیٹی کا دوپٹہ دبائے گھومتا ہے بیٹی کو زندہ دیکھ کر اتنا خوش ہوتا ہے کہ اس کی ناشائستہ حرکت پر اس کی توجہ بھی نہیں جاتی ۔

۱۔ اردو کے بہترین افسانے ، مرتبہ پرکاش پنڈت ، یونین پرنٹنگ پریس، دہلی ۔ ص ۲۵

یہاں افسانہ نگار کا مقصد پوشیدہ جسم کی نمایش نہیں بلکہ اس وحشت کا احساس دلانا ہے جو فسادات کے زیر اثر عام ہوئی تھی ۔

تقسیم ہند اور فسادات کے موضوع پر بیدی کا " لاجونتی " اس موضوع پر بہترین افسانہ ہے ۔ " لاجونتی " ایک ہنگامی واقعہ کی کہانی ہے لاجونتی کا کردار اس مغویہ عورت کی کہانی ہے جو بازیافت ہوکر دوبارہ اپنے شوہر کے پاس واپس آتی ہے ۔ یہاں اگر بیدی اس کے شوہر سے لاجونتی کو اپنانے میں ہچکچاہٹ محسوس کراتے تو یقیناً لاجونتی کوئی بھی راستہ اپنا سکتی تھی یہ راستہ اسے بربادی کی طرف بھی لے جاسکتا تھا اور اگر سندر لال اسے پہلے جیسی اپنائیت دے دیتا تو اس کے اس اصلاحی انجام میں اتنی حقیقت اتنی سچائی پیدا نہ ہوتی ۔ لاجونتی کو اس کا گھر اس کا شوہر سب کچھ مل جاتا ہے مگر اس کا ماضی اور ماضی میں شوہر کی اپنائیت اسے نصیب نہیں ہوتی ۔۔۔

" وہ سندر لال کی وہی پرانی لاجو ہونا چاہتی تھی
جو گاجر سے لڑ پڑتی اور مولی سے مان جاتی لیکن
اب لڑائی کا کوئی سوال ہی نہ تھا سندر لال نے اسے
یہ محسوس کرادیا تھا جیسے وہ ۔۔۔ لاجونتی ۔۔۔
کانچ کی کوئی چیز ہے جو چھوتے ہی ٹوٹ جائے گی ۔"۱۔

حیات اللہ انصاری نے فسادات کے موضوع پر " شکرگزار آنکھیں " اور " ماں بیٹا " افسانے لکھے ۔ ان کو محض تاثراتی یا واقعاتی افسانے کہا جاسکتا ہے ۔ ان میں " آخری کوشش " جیسی فن کی لطافت نہیں ۔۔ " شکرگزار آنکھیں " میں ایک طرح کی ڈرامائیت چھائی رہی ہے ۔ ایک دلہن ظالموں سے یہ التجا کرتی ہے

راجندر سنگھ بیدی ، اپنے دکھ مجھے دیدو ۔ سن اشاعت بارسوم ، مارچ ۵۷ء ص ۲۲

کہ اس کا خون اس کے شوہر کے سامنے کیا جائے اور وہ دلہن کی یہ خواہش پوری کردیتے ہیں — مرنے کے بعد بھی لگتا تھا کتنی " شکر گزار تھیں اس کی آنکھیں " —— افسانہ نگار نے فرقہ وارانہ فسادات کا ذکر کرتے ہوئے اس بہادر عورت کے مرنے کا منظر پیش کیا ہے اور اس سے نتیجہ صرف اس قدر نکالا :-

> " اس رات میں نے جانا کہ بہادر مظلوم لاکھ درجہ خوش نصیب ہوتا ہے بذدل ظالم سے "-۱-

حیات اللہ انصاری کا دوسرا افسانہ " ماں بیٹا " بھی فسادات کے موضوع پر لکھا گیا ہے — اس افسانے میں مومنہ کے کردار کے ذریعہ ایک عورت کا تنہا در بدر بھٹکنا بغیر کسی انسان کے صرف ایک " آشا " کتیا اور ایک اندھے بچے کے ساتھ رہنا اور گرے پڑے چنوں سے پیٹ بھرنا پڑھنے والے کو حقیقی دنیا سے دور رکھتا ہے اور ذہن کسی طرح ماننے پر تیار نہیں ہوتا کہ ایک عورت اتنی باہمت ہوسکتی ہے جسے زندگی اس قدر پیاری لگے کہ بغیر دانا پانی اور بغیر کسی سہارے کے وہ ہر حال میں زندگی کو ترجیح دے ——

قرۃ العین حیدر نے بھی تقسیم ہند پر کہانیاں لکھیں جن میں ان کا افسانہ " جلا وطن " اہم ہے اور ہندو مسلم بھائی چارگی کی ایک اچھی تصویر پیش کرتا ہے - ایک ہی زمین پر برسوں تک رہنے کے باوجود یہ دونوں قومیں آخر کیوں نہ ایک

۱- حیات اللہ انصاری - شکستہ کنگورے - ص ۱۳۸ - ۱۹۵۲ء

یونین پرنٹنگ پریس ، دہلی -

ہو سکیں دونوں میں اتفاق ، اتحاد کی جڑیں کیوں کھوکھلی ہوتی گئیں ؟ اور آخر کار تقسیم کا المیہ کیوں پیش آگیا ۔وہ مسلم جنھوں نے ہندوستان ہی کو اپنا وطن سمجھا اور پاکستان نہ گئے وہ اپنے ہی ملک میں کس طرح جلا وطن ٹھہرے ؟ افسانہ ایک لمبے چوڑے کینوس پر پھیلتا گیا ہے ۔تقسیم سے پہلے اور بعد کے جونپور کے محرّم کی تصویر کشی کی گئی ہے ۔

تقسیم ہند کا المیہ پیش آچکا تھا ۔پاکستان ، مسلمانوں کا ایک نیا اور الگ ملک وجود میں آچکا تھا ـــــ لیکن اب بھی ہندوستان میں ، جونپور میں مسلمانوں کے بعض خاندان ایسے تھے جنھوں نے پاکستان کے بجائے ہندوستان ہی میں رہنا پسند کیا ۔محرّم اس بار بھی آیا ـــــ نقارے اب کے بھی بجے ، مجلسیں اس بار بھی منعقد ہوئیں مگر وہ بات کہاں ؟؟؟ قرت العین حیدر نے ہندوستان تقسیم ہونے کے بعد جونپور کے ایک محرم کی تصویر اس اقتباس میں اس طرح پیش کی ہے ـــــ

" آج چاند نی رات تھی ۔محلے میں نقارہ رکھا جاچکا تھا ۔
مجلسیں اب بھی ہوتیں ۔لیکن وہ چہل پہل ، رونق اور
بے فکری تو کب کی خواب و خیال ہوچکی تھی ـــــــ
مولا ، یہ میرا آخری محرم ہے ارے اب تمہاری مجلسیں
یہاں اب کیسے ہوں گی ؟ ـــــ اور یہ کہکر انھوں نے
زور شور سے رونا شروع کردیا ۔" ۱

عصمت چغتائی بھی تقسیم وطن کا غم بڑے جذباتی انداز میں " جڑیں " لکھ کر کیا ـــــ ہندو مسلمان جس سر زمین پر برسوں شیر و شکر ہوکر رہے دونوں کے

۱۔ پت جھڑ کی آواز ، قرت العین حیدر ، ص ۸۷ ، جولائی ۱۹۷۵ء

خوشی و غم میں ساتھ ساتھ رہے ۔ملک کی اچانک تقسیم دونوں کو علحیدہ ہوجانے پر مجبور کردیتی ہے ، مگر بوڑھی " اماں " کا کردار یہ ماننے پر تیار نہیں کہ وہ سر زمین جس کی خاک میں یہ خاندان پلا بڑھا اس کے علاوہ بھی اسکا کوئی اپنا وطن الگ ہوسکتا ہے ؟ ——

" اپنا وطن " ہے کس چڑیا کا نام ؟ لوگو ! بتاؤ وہ ہے کہاں
" اپنا وطن " ؟ ۔جس مٹی میں جنم لیا جس پہ لوٹ پوٹ کر
بڑے پلے ، وہی اپنا وطن نہ ہوا تو پھر جہاں چار دن کو جاکر
بس جاؤ وہ کیسے اپنا وطن ہوجائیگا ۔اور پھر کون جانے ،
وہاں سے بھی کوئی نکال دے ؟ کہیے جاؤ ، نیا وطن
بساؤ اب یہاں چراغ سحری بنی بیٹھی ہوں ۔ایک ننھا
سا جھونکا آیا اور وطن کا جھگڑا ختم ۔"۱۔

تقسیم ہند کا غم ایک وقتی سیلاب تھا جو وقت کے ساتھ ساتھ کم ہوتا گیا ۔ لوگوں کے دلوں سے اسکا اثر مٹتا گیا ۔ملک کے ، بٹنے ، زبان کے بٹنے ، اور سرحد کے دونوں طرف لوگوں کے گھر سے بے گھر ہونے کا المیہ ماند پڑتا گیا ۔وہ لکھنے والے جنھوں نے تقسیم کے دکھ درد سہے تھے ، اب تھکنے لگے ، اور نئے لکھنے والوں میں وہ لوگ سامنے آئے جو نہ تو آزادی کی لڑائی میں شریک ہوئے تھے اور نہ ہی تقسیم ہند کے المناک واقعات کے تماشائی تھے ——شہروں کی ہنگامی زندگی ، بے روزگاری کے مسائل ، طبقاتی کشمکش کے نئے لکھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ۔اس طرح اردو افسانے کے موضوعات میں اب وسعت پیدا ہوئی ——

—— ×××× ——

۱۔ چھوٹی ہوئی ، عصمت چغتائی ۔ ص ۱۲۵ ، اور سیز بک سینٹر ۔

تقسیم ہند سے پہلے کے افسانہ نگار ـــــ تقسیم ہند کے بعد

وہ افسانہ نگار جو تقسیم ہند سے پہلے ہی افسانہ نگاری میں اہم مقام پیدا کرچکے تھے ان کے افسانوں کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو ان کے اسلوب ، تکنیک اور کردار نگاری میں تبدیلی کا اندازہ ہوگا ـــــ مثلاً منٹو ، جنکا اہم موضوع جنس رہا ہے ۔اس موضوع پر ان کے لا تعداد افسانے ہیں جن میں "کالی شلوار" ، "ہتک" ، ٹھنڈا گوشت ، کھول دو ، قابل ذکر ہیں ـــــ ۱۹۵۰ء کے بعد منٹو کے افسانوں میں واقعات سے زیادہ ، کردار نگاری پر توجہ دی گئی ہے ، ان کرداروں کی ذہنی کشمکش پر منٹو کی خاص توجہ رہتی ہے ، اس کی بہترین مثال "ہتک" کا کردار ، "سوگندھی" ہے ، یہ ایک ایسی طوائف کا کردار ہے جو پیشہ کرنے کے باوجود دل کے کسی کونے میں گھریلو عورت کی تصویر رکھتی ہے ۔سوگندھی ، جسکا کام صرف مردوں کو تسکین دینا ہے اور پیسے کمانا ہے یہ ایک ایسا سودا ہے جو وہ بغیر سوچے سمجھے کرتی ہے اور جس میں اپنائیت ، شرافت کی کوئی گنجائش ہی نہیں ، لیکن جب خود "سوگندھی" کا چاہنے والا "مادھو" جس کے پاس رہنے کے لئے کچھ نہیں تھا اور وہ پیشہ سوگندھی سے کچھ نہ کچھ وصول ہی کرلیتا تھا ـــــ سوگندھی کی اپنائیت مادھو کے وہ جملے ہیں جو اس نے پہلی ملاقات پر سوگندھی سے کہے تھے :-

"تجھے لاج نہیں آتی ، اپنا بھاؤ کرتے - جانتی ہے تو

میرے ساتھ کس چیز کا سودا کر رہی ہے ؟ ——— ؟ اور میں
تیرے پاس کیوں آیا ہوں ؟ ———چھن چھن چھن ———
دس روپئیے ، اور جیسا کہ تو کہتی ہے ڈھائی روپیے دلال
کے ، باقی رہے ساڑھے ساتھ روپیے ، رہے نا ساڑھے سات ؟ —
اب ان ساڑھے سات روپیوں پر تو مجھے ایسی چیز دینے کا وچن دیتی
ہے جو دے ہی نہیں سکتی اور میں ایسی چیز لینے آیا ہوں جو میں
لے ہی نہیں سکتا — مجھے عورت چاہئیے ، پر تجھے کیا اس وقت
اسی گھڑی مرد چاہئیے مجھے تو عورت بھا جائیگی — پر کیا میں
تجھے جچتا ہوں ———بس دس روپئیے جن میں ڈھائی دلال میں
چلے جائیں گے اور باقی ادھر ادھر بکھر جائیں گے — تیرے اور
میرے بیچ میں بج رہے ہیں ———تو بھی انکا بجنا سن رہی ہے
اور میں بھی تیرا من کچھ اور سوچتا ہے میرا من کچھ اور ———
کیوں نہ کوئی ایسی بات کریں کہ تجھے میری ضرورت ہو اور مجھے
تیری پونے میں حولدار ہوں ، مہینہ میں ایک بار آیا کروں گا
تین چار دن کے لئیے یہ دھندا چھوڑ میں تجھے خرچ دیا کروں گا ۔"
کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا ؟؟؟ ! ۔" ۱ ۔

اس کہانی میں سوگندھی کی اندرونی کشمکش کا اندازہ اسکی سوچ سے بھی
کیا جاسکتا ہے ———کپڑے پھاڑ کر اسکے سامنے ننگی ہو جاؤں اور کہوں ———

---

۱ ۔ منٹو کے نمائندہ افسانے ۔ مرتبہ ۔ ڈاکٹر اطہر پرویز ، ص ۷۰ ، ۱۹۷۷ء
ایجوکیشنل بک ہاؤس ، علی گڑھ ۔

بھی لینے آیا تھا نہ تو ؟ ـــــ لے دام دئیے بنا ہی
لے جا ـــــ پر جو کچھ میں ہوں جو کچھ میرے اندر
چھپا ہوا ہے وہ تو کیا ، تیرا باپ بھی نہیں خرید سکتا !!۔" ۱۔

منٹو کے افسانوں میں انسان دوستی کا جذبہ بھی ابھرتا ہوا نظر آتا ہے جسکا اندازہ " بابو گوپی ناتھ" کے ایک کردار زینت سے لگایا جاسکتا ہے ۔ زینت ، یہ ایک ایسا کردار ہے جسے قدم قدم پر دھوکہ ملا ہے ۔جانے کتنے لوگوں نے اس کے دل اور جسم سے کھیلا ہے ۔مگر گوپی ناتھ دل سے زینت کی بہتری چاہتا ہے۔ زینت کسی کے ساتھ بھی رہی ہو ، گوپی ناتھ کو اسکی فکر رہی ہے ـــــ اور جب حیدرآباد نواب کے ساتھ زینت کی شادی ہوتی ہے تو گوپی ناتھ دل و جان سے اس کی تیاری کرتا ہے ۔جب زینت دلہن کی شکل میں تیار ہوتی ہے تو کہانی کا ایک کردار ' منٹو کہتا ہے :۔

" میں پردہ ہٹاکر اندر داخل ہوا ۔زینت سرخ زربفت
کا شلوار کرتہ پہنے تھی ۔دوپٹہ بھی اس رنگ کا تھا
جس پر گوٹ لگی تھی ۔چہرے پر ہلکا ہلکا میک اپ تھا ۔
حالانکہ مجھے ہونٹوں پر لپ اسٹک کی سرخی بہت بری
معلوم ہوتی تھی ـــ مگر زینت کے ہونٹ سجے ہوئے تھے
اس نے شرماکر مجھے آداب کہا ، بہت پیاری لگی ـــ
جب میں نے دوسرے کونے میں ایک مسہری دیکھی جس
پر پھول تھے تو مجھے بے اختیار ہنسی آگئی ـــ میں نے

۱۔ منٹو کے نمائندہ افسانے ، مرتبہ ۔ڈاکٹر اطہر پرویز ۔ ص۰ ۱۷۰ ، ۱۹۷۷ء
ایجوکیشنل بک ہاؤس ۔علی گڑھ ۔

زینت سے کہا ، یہ کیا مسخرہ پن ہے " ۔زینت نے میری
طرف بالکل معصوم کبوتری کی طرح دیکھا — " آپ مذاق
کرتے ہیں بھائی جان ! " اس نے یہ کہا اور آنکھوں میں
آنسو ڈبڈبا آئے ———مجھے ابھی غلطی کا احساس بھی
نہ ہوا تھا کہ بابو گوپی ناتھ اندر داخل ہوا ۔بڑے پیار کے
ساتھ اس نے اپنے رومال سے زینت کے آنسو پونچھے ، اور
بڑے دکھ کے ساتھ مجھ سے کہا ! — " منٹو صاحب !
میں سمجھا تھا آپ بڑے سمجھدار اور لائق آدمی ہیں —
زینو کا مذاق اڑانے سے پہلے آپ نے کچھ سوچ لیا ہوتا " ! ! ۔۱

۱۹۴۷ء کے بعد منٹو کے افسانوں میں اہم افسانہ " موذیل " ہے ۔منٹو
کے افسانوں میں سماج کے ٹھکرائے ہوئے مریض اور ضد ی قسم کے کردار نظر آتے ہیں
" موذیل " ان افسانوں میں اہم ہے ۔ یہ ایک آوارہ یہودن لڑکی کی کہانی ہے ۔
جسے مذہب اور سماج سے کوئی تعلق نہیں ۔وہ تمام تر سماجی مذہبی قدروں سے باغی
ہے لیکن انسان دوستی قابل قدر ہے ۔وہ مسلمانوں کے محلہ میں گھری ہوئی ایک سکھ
لڑکی کو ، اپنی جان دیکر بچا لیتی ہے ۔منٹو یہاں صرف موذیل کی آزاد روی اور
اقدار شکنی پر بحث ختم نہیں کرتا ، بلکہ اسکی انسان دوستی کو واضح کرتا ہے۔
وہ مرتے وقت بھی سماج کی سطحی قدروں کا مذاق اڑاتی ہے ۔

موذیل نے اپنے بدن پر سے ترلوچن کی پگڑی ہٹالی ۔
لے جاؤ اسکو ———اپنے اس مذہب کو ، اور اسکا بازو

۱۔ منٹو کے نمائندہ افسانے ۔مرتبہ ۔ ڈاکٹر اطہر پرویز ۔ ص ۱۴۲ ۔ ۱۹۷۷ء
ایجوکیشنل بک ہاؤس ، علی گڑھ ۔

اسکی مضبوط چھاتیوں پر بے حس ہوکر گر پڑا —" ۱۔

اور یہی جملے افسانے کا انجام بھی ہیں ۔

اسی زمانے میں منٹو نے ایک افسانہ " سڑک کے کنارے" لکھا ۔اس افسانہ میں دو کردار ہیں ۔ایک کہانی بیان کرتا ہے اور دوسرے کردار کی کہانی میں صرف جھلک نظر آتی ہے ۔

غیر شادی شدہ عورت جس کے اندر ماں بننے کی شدید خواہش ہے مگر وہ سماج کے ڈر سے بچہ کی تخلیق سے بچنا چاہتی ہے ۔وہ جانتی ہے اسکی طرف انگلیاں اٹھیں گی ۔لہذا وہ اس وقت تک ذہنی کرب میں مبتلا رہتی ہے جب تک کہ وہ بچہ کے رونے کی آواز اپنے کانوں سے سن نہیں لیتی ۔اس کے بعد اس میں بلا کی ہمت آجاتی ہے ——

" انگلیاں —— اٹھنے دو انگلیاں —— میں انہیں
کاٹ ڈالوں گی ——شور مچیگا میں یہ انگلیاں اپنے کانوں
میں ٹھونس لوں گی میں گونگی ہوجاؤں گی ، بہری
ہوجاؤں گی ، اندھی ہوجاؤں گی ——میرا گوشت میرے
اشارے سمجھ لیا کرے گا —میں اسے ٹٹول کر پہچان لیا
کروں گی —— " ۲۔

۱۔ منٹو کے نمائندہ افسانے ۔مرتبہ ۔ڈاکٹر اطہر پرویز ۔ ۱۹۷۷ء ص

۲۔ منٹو کے نمائندہ افسانے ، مرتبہ ڈاکٹر اطہر پرویز ۔ ص۲۲۰

عورت اپنا وجود کھوکر اس گوشت کو پالینا چاہتی ہے ۔اسے اب اس دنیا میں کچھ نہیں سننا ہے کچھ نہیں دیکھنا ہے ۔وہ ڈرتی ہے کہ اسکی زندگی کا یہ مرکز بھی کہیں اس سے چھین نہ جائے اور اس کے منہ سے ——— " مت چھینو " — مجھ سے جدا نہ کرو ، ——— خدا کے لئے مجھے اس سے جدا نہ کرو ! ——— " کی بے بس آوازیں فضا میں گونجتی رہتی ہیں ———اور پھر سماج کی نا انصافی کا اظہار اخبار کی ایک خبر سے ہوتا ہے ———

" دھوبی منڈی سے پولیس نے ایک نو زائدہ بچی کو
سردی سے ٹھٹھرتے سڑک کے کنارے پڑی ہوئی پایا ۔
اور اپنے قبضہ میں لے لیا ۔کسی سنگ دل نے بچہ کی گردن کو
مضبوطی سے کپڑے میں جکڑ رکھا تھا اور عریاں جسم کو پانی سے
گیلے کپڑے میں باندھ رکھا تھا تاکہ وہ سردی سے مرجائے ،
مگر وہ زندہ تھی ———اس کو ہسپتال پہنچادیا گیا ۔" ۱۔

اس افسانے میں منٹو کی جنس کا تصور دوسرے افسانوں سے مختلف ہے ۔یہاں عورت ماں بنکر خود اپنی زندگی میں کوئی کشش محسوس نہیں کرتی ۔اور خود اپنے ہی جسم کے ایک ٹکڑے کو خود سے الگ کرنے کے جتن میں مشغول رہتی ہے ۔

منٹو کی طرح عصمت چغتائی کے افسانوں کا اہم موضوع بھی جنس رہا ہے مگر دونوں میں فرق ہے ، منٹو کے کردار ضدّی ، سماج کے ٹھکرائے ہوئے ہوتے ہیں ، جو اپنا نظریہ رکھتے ہیں ——ان کے یہاں عورت گھر کی چہار دیواری میں نظر نہیں آتی ۔

۱۔ منٹو کے نمائندہ افسانے ۔مرتبہ ، ڈاکٹر اطہر پرویز ۔ ص ۲۲۱ ۔ ۱۹۷۷ء
ایجوکیشنل بک ہاؤس ، علی گڑھ ۔

ہاں کبھی کبھی ایک گھر بسانے کی تمنا ضرور کرتی ہے ۔کبھی حالات اسے طوائف بنا دیتے ہیں اور کبھی مذہب و سماج کی قید و بند کو توڑتی ہوئی نظر آتی ہے — برخلاف اسکے عصمت کے کردار زیادہ تر گھروں کی چہار دیواری تک رہتے ہیں ۔ایک ہندوستانی گھر ، جس میں عورت گھریلو زندگی میں بچہ پالتی نظر آتی ہے اور کمسن لڑکیاں گھٹی گھٹی زندگی گزارتی ہیں جو اکثر ذہنی طور پر جنسی بیماری کا شکار رہتی ہیں ۔عصمت کا یہ کارنامہ ہے کہ انہوں نے افسانے کے ذریعہ عورت کی نفسیات کو دریافت کرنے کی کوشش کی ہے ——— معاشرہ کے بہت سے ایسے پہلوؤں کو عصمت نے بے نقاب کیا ہے جنکو جانتے ہوئے بھی لوگ نظر انداز کرجاتے تھے ۔دو ہم جنسوں کا ایک دوسرے سے جنسی تعلق بہت پہلے سے سماج میں پایا جاتا تھا مگر عصمت نے سب سے پہلے اسے اپنے افسانہ کا موضوع بنایا — " لحاف" جسکی بہترین مثال ہے —

تقسیم ہند کے بعد عصمت کی کہانیوں کا انداز کچھ بدل جاتا ہے جنس کے علاوہ بھی دوسرے موضوعات پر انکا قلم اٹھتا ہے ۔اس زمانے کا انکا ایک مجموعہ " چھوئی موئی " ہے جسکا شاہکار افسانہ ——— " چوتھی کا جوڑا " کہا جاسکتا ہے ۔یہ پروفیسر محمد حسن کے الفاظ میں ایک عظیم تہذیبی مرثیہ معلوم ہوتا ہے اس میں مسلم متوسط طبقہ کی عکاسی کی گئی ہے اس افسانہ کے کردار " کبریٰ" کی ماں اور " حمیدہ" ایک محدود دنیا کی رہنے والی ہیں ۔جنکی خوشیاں محدود ہیں جنکی آرزوئیں محدود ہیں ——کبری کی ماں کی سب سے بڑی خوش نصیبی یہی ہے کہ کس طرح کبری کے کھردرے ، پلدی ، دھنیا کی (بساند) میں سنے ہوئے ہاتھوں میں مہندی رچ بس جائے ——عصمت کا یہ ماحول جانا پہچانا ماحول ہے ۔اس طرح کے

نہ جانے اور کتنے کردار ہندوستانی گھروں کی چہار دیواروں میں رہتے ہیں —— ہاں اس افسانے میں ایسے ٹکڑوں کی بھی انتہا نہیں جہاں عصمت کا قلم جذباتی ہو گیا ہے ——

" یاد نہیں ، کب اس شبنمی دوپٹہ کے بنے ٹکے تیار ہوئے اور گاڑی کے بھاری قبر جیسے صندوق کی تہ میں ڈوبے گئے - کٹوریوں کے جال دھند لائے گنگا جمنی کرنیں ماند پڑ گئیں - طول کے لچھے اداس ہوگئے مگر کبری کی بارات نہ آئی جب ایک جوڑا پرانا ہوجاتا تو اسے چالے کا جوڑا سینت دیا جاتا اور پھر ایک نئے جوڑے کے ساتھ نئی امیدوں کی افتتاح ہوجاتی - بڑی چھان بین کے بعد نئی دلہن چھانٹی جاتی سہ دری کے چوکے پر صاف ستھری جاذم بچھتی ، محلہ کی عورتیں ہاتھ میں پاندان اور بغلوں میں بچہ دبائے جھانجھیں بجاتے آن پہنچتیں - " ۱ -

لیکن ڈاکٹر محمد حسن —— یہ جذباتی ٹکڑے کرشن چندر کی طرح باہر سے نہیں آتے خود افسانے کے واقعات سے پیدا ہوتے ہیں وہ افسانے پر غالب نہیں ہیں اسکا ایک خوبصورت جزو ہیں - وہ اسکا اکیلا جو ہر نہیں زیور ہیں —— اس افسانہ کے علاوہ عصمت کے دوسرے افسانے " کینڈ ل کورٹ " اور " سونے کا انڈا " ہیں —— کینڈ ل کورٹ میں مختلف زندگیاں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں جن میں چمار چاٹ والا اور فلمی ہیرو بننے کا خواہش مند بھی ہے —— اور کہانی کہنے والا ایک تماشائی

۱- چوتھی کا جوڑا - عصمت چغتائی (چھوئی موئی) ص ۸۷ ، او ر سیز بک سینٹر بمبئی

کی شکل میں پورے وقت ساتھ رہا ہے ——سونے کا انڈا لڑکی کی پیدائش کی بد نصیبی کا بیان ہے ——بندو میاں کے یہاں جب تیسری اولاد بھی لڑکی پیدا ہوتی ہے تو خوشی کے بجائے :-

" دادا کی سفید داڑھی پر اوس پڑھ گئی اور دادی کے ارمانوں کا شیرازہ ہوا میں اڑ گیا —دائی ماش موئی کالیاں عورت ذات کے جنم میں ٹھوکنے لگی -اسکا بس چلتا تو وہ ایک سرے سے عورت کی پیدائش کا گلا ہی گھونٹ دیتی اسکا بیج بھی دنیا سے مٹادیتی -اللہ ماری رات کے ۲ بجے اور پھر خاک پڑی اور نصیبوں جلی لونڈیا —— اور پھر نصیبوں جلی لونڈیا —— اور پھر نصیبوں جلی لونڈیا ——" ۱-

مگر یہ نصیبوں جلی لونڈیا کہنے والے لڑکی کے دادا دادی ہوتے ہیں جنکے خیالات یقیناً آخری سانسیں لے رہے ہوتے ہیں -زمانے کے ساتھ ساتھ بندو میاں بھی لڑکی کے باپ کے خیالات کس قدر بدل چکے تھے ہوتے ہیں :-

شوکت حشمت —— اور اسکا نام ——رحمت کیوں ٹھیک ہے نا ؟ انہوں نے بچی کے پھول سے نرم رخسار کو انگلی سے چھوا اور مسکرانے لگے -آج نہ ان کے چہرے پر کھسیان -پن تھا اور نہ آنکھوں میں ملامیت نہ ان کے انداز میں از سر نو پیغام تھا نہ جھوش امیدوں کے غیر مطمئن

۱- سونے کا انڈا ، عصمت چغتائی (چھوٹی موئی) ص- ۱۷۸ ، اوور سیز بک سینٹر ، بمبئی -

سائے جیسے وہ کچھ سوچ سمجھ کر کسی بڑے دشمن
سے جیت کر آئے ہوں ـــــــ" ۱۔

کرشن چندر کے افسانہ کا موضوع کچھ بھی ہو مگر انداز پر رومانیت کا غلبہ ہوتا ہے زبان بڑی مرسع ملتی ہے خیال کو زیادہ سے زیادہ دلکش انداز میں بیان کرنے کی کوشش ملتی ہے — سیاسی اور ہنگامی حالات بھی ان کے موضوع ہیں مگر ہر جگہ انداز بیان پر ہی توجہ ملتی ہے — وہ زندگی کی تلخیوں کو بھی اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ بجائے اس سے فرار کے زندگی کو گلے لگانے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے — انتظار حسین اور ہنسراج رہبر نے اسے کرشن چندر کا عیب مانا ہے — اور پروفیسر محمد حسن نے "ادبی تنقید" میں اردو افسانے "کے عنوان سے ایک مضمون میں کہا ہے :-

کرشن چندر نے رومانوں کو فن میں بنیادی جگہ دی ہے ابھی
تک انکی کہانیاں اس محور سے آگے نہیں بڑھی ہیں —
کرشن چندر کا راستہ حقیقت نگاری کا راستہ نہیں ہے بلکہ
حقیقت پر دور سے کبھی فلسفیانہ اور کبھی ایک
نظر ڈالنے کا ہے — وہ ہنوز اس تاریک سیارے کے نغمے سے
نا آشنا ہیں وہ رہٹ ، پل ، دیہات کے چوپال اور کسان کے
بارے میں شاعری تو کرتے ہیں مگر انکی زندگی کو تمام جزئیات
کے ساتھ پیش نہیں کرتے ـــ" ۲۔

---

۱ — سونے کا انڈا — عصمت چغتائی (چھوٹی موٹی) ص ۱۸۰ — اوور سیز بک سینٹر — بمبئی —

۲ — ادبی تنقید — ڈاکٹر محمد حسن — ص ۱۱۵ — ۱۱۴ ، ۱۹۵۴ء سرفراز قومی پریس نادان محل روڈ لکھنئو —

کرشن چندر کے افسانے میں رومانوں کو بنیادی جگہ ملی ضرور ہے مگر جب انکا قلم اس محور سے آگے نکل کر " ان داتا " جیسی کہانی کو جنم دیتا ہے تو یہ کہنا ذرا مشکل ہوجاتا ہے کہ کرشن چندر کا راستہ حقیقت نگاری کا راستہ نہیں ہے - یہ افسانہ قحط بنگال پر ایک کامیاب افسانہ ہے جو پورے قحط کے واقعہ کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے -یہاں کرشن چندر کی زبان شاعرانہ نہیں بلکہ سیدھی سادھی زبان ہے - " ان داتا " یعنی اس طویل افسانے کے تین حصہ ہیں -

پہلا حصہ —— " وہ آدمی جس کے ضمیر میں کانٹا ہے " کے تحت انہوں نے قحط کا دردناک منظر پیش کیا ہے :-

" آج ہمارے سفارت خانے کے باہر دو عورتوں کی لاشیں پائی گئی ہیں —ہڈیوں کا ڈھانچہ معلوم ہوتی تھیں - شاید سوکھیہ کی بیماری میں وہ مبتلا تھیں ——— ادھر بنگال میں ، اور غالباً سارے ہندوستان میں سوکھیہ کی بیماری پھیلی ہوئی ہے اس عارضہ میں انسان گھلتا رہتا ہے اور سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ ہوکر مرجاتا ہے ———

———————————

سفارت خانے کے باہر پڑی ہوئی لاشوں میں ایک بچہ بھی تھا -جو اپنی مری ہوئی ماں کے تھنوں سے دودھ چوسنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا -میں نے اسے ہسپتال بھجوادیا ہے -"۱-

TH - 339

اس منظر کے بعد واقعہ حکومت کی زیادتیاں بتاتا ہے -

TH-339

۱- ان داتا -کرشن چندر ، ص ۹ -راجیو پرکاشن ، نئی دہلی -

JAWAHARLAL NEHRU UNIVERSITY LIBRARY
0,168,3 N7:g
DISS
16869

" مختلف صوبائی حکومتوں نے رعایا میں اناج تقسیم
کرنے کی جو اسکیم بنائی ہے اس سے انہوں نے کئی
لاکھ روپئے کا منافع حاصل کیا ہے ۔اس میں بنگال
کی حکومت بھی شامل ہے ۔" ۱۔

دوسرا حصہ : " وہ آدمی جو مرچکا ہے " کے تحت ایک ایسے انسان کی عکاسی کی گئی جو بظاہر زندہ تو ہے مگر مردوں سے بدتر ـــــ قحط زدہ لوگوں کے لئے چندہ جمع کرنے کے بعد اسکا استعمال کچھ اس انداز سے کرتے ہیں:-

"اسنیہ اور وہ ایک میز کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے ۔
اسنیہ سے پوچھا کتنے روپئے اکھٹا ہوئے ہیں ؟ ـــ
سازے چھ ہزار ا ـــــ ابھی تو ناچ عروج پہ ہے ۔
صبح چار بجے تک ۹ ہزار روپے ہوجائیگا ۔آج تم نے
بہت کام کیا ہے ـــ اسنیہ نے اسکی انگلیوں کو چھوکر
کہا ـــــ کیا پیوگی ؟ ـــ تم کیا پیو گے ؟ ا جن اور
سوڈا ـــــ اسنیہ بولی صاحب کے لئے ایک لائم جن لاؤ ۔
اور سوڈا ـــــ اور تم ؟ ـــــ ناچتے ناچتے اور پیتے پیتے
پریشان ہوگئی ہوں ـــ اپنے وطن کے خاطر سب کچھ کرنا
پڑتا ہے ڈارلنگ : اس نے سنیہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا ۔" ۲۔

۱۔ ان داتا ۔ کرشن چندر ۔ ص ۲۲ ۔ راجیو پرکاشن ، نئی دہلی ۔
۲۔ ان داتا ۔ کرشن چندر ۔ص راجیو پرکاشن ، نئی دہلی ۔

تیسرا حصہ :- "وہ آدمی جو ابھی زندہ ہے" اس میں ایسے ماحول کا عکاسی کی گئی ہے جس میں لڑکیاں کوڑیوں کے دام بک رہی تھیں -

" نوجوان لڑکیاں بکریوں کی طرح تولی جاتی تھیں
مال اچھا ہے ، رنگ کالا ہے ، ذرا دبلی ہے - منہ
پر چیچک ہے ، ارے ، اس کے تو بالکل ہڈیاں نکل
آئی ہیں ـــــ چلو خیر ٹھیک ہے ، دس روپے دیدو ا - " ۱

ایسے ماحول میں جب کہ خاوند بیوی کو ، مائیں اپنی لڑکیوں کو ، بھائی ، بہنوں کو فروخت کر رہے تھے ایک ایسے انسان کی عکاسی کی گئی ہے جسے اپنی بیوی کے مرنے کا غم پریشان نہیں کرتا بلکہ بیوی کا وہ خیال کہیں زیادہ اذیت دینے لگتا ہے جب وہ اپنی بچی کو بیچنے کا ارادہ کرتی ہے ـــــ یہ انسان اس کسمپرسی کے عالم میں بھی اپنے حساس ذہن اور عقیدت مند مزاج کو جھنجوڑتا ہے اور یہ سوچنے لگتا ہے :-

" جب تک دنیا میں ایک شخص بھی بھوکا ہے یہ دنیا
بھوکی رہیگی - جب تک دنیا میں ایک آدمی بھی غلام
ہے ، سب غلام رہیں گے ، جب تک دنیا میں ایک آدمی
بھی مفلس ہے سب مفلس رہیں گے - " ۲ -

مندرجہ بالا تمام مثالوں سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ کرشن چندر حقیقت نگاری کا راستہ بھی اپنا سکتے تھے - " ان داتا " میں پورا واقعہ (قحط بنگال) بڑی

---

۱ - ان داتا - کرشن چندر - ص ۲۲ - راجیو پرکاشن ، نئی دہلی -
۲ - ان داتا - کرشن چندر - ص ۵۳ - راجیو پرکاشن ، نئی دہلی -

سچی اور حقیقی تصویر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے ۔یہ احساس کی شدت اور طنز کی نشتریت ، پر اعتبار سے کامیاب افسانہ ہے ۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن :۔

" افسانے کا فن اشاروں کا فن ہے ، اس میں واقعہ سب کچھ کہتا ہے ۔اس کی زبان شوخ رنگوں کی نہیں ، نرم و لطیف نغموں کی ہے ۔اس لئے مصنف کی اپنی تقریروں کے بجائے کہانی کا مجموعی تاثر خود ہزار باتیں کہتا ہے ، اور لاکھوں ان کہے تاثرات چھوڑتا ہے ۔" ۱۔

اس افسانے میں واقعہ خود بخود/سب بیان کرتا چلا جاتا ہے ۔زبان کے شوخ رنگ آنکھوں کو کہیں بھی ناگوار نہیں ہوتے ۔مصنف کہیں بھی تقریر کرتے نظر نہیں آتا ۔اور افسانہ پڑھنے کے بعد پورا درد ناک واقعہ آنکھوں میں گھوم جاتا ہے ۔

ایک جگہ پر اور پروفیسر محمد حسن کہتے ہیں :۔

" کرشن چندر کی بہت سی کہانیاں جذباتیت سے بوجھل ہوتی ہیں ۔"

اور شاید اسی وجہ سے کرشن چندر کو انہوں نے محض رومانی اور جذباتی افسانہ نگار کہ ڈالا ہے جسکا حقیقت نگاری سے کوئی واسطہ نہیں ہے ۔

کرشن چندر کے یہاں نہ تو کوئی جذباتیت ہے اور نہ ہی خالص تخیل پرستی وہ زندگی کی تلخیوں ، ناکامیوں ، اور دوسرے مسائل کو بھی شاعرانہ انداز میں بیان کرتے ہیں ۔اپنے ایک افسانے " ہوس " میں کرشن چندر اپنے محبت آمیز لہجہ

۱۔ادبی تنقید ۔ڈاکٹر محمد حسن ۔ ص ۸۲

کی عکاسی ایک کردار کی زبانی اسطرح کرتے ہیں :-

" محبت پر خوبصورت سماج کی پہلی عزت اور آخری
شرط ہے اور اس کے بغیر دنیا میں کوئی انسانی سماج
تادیر نہیں پنپ سکتا -" ۱-

" جدید اردو ادب" میں مختصر افسانے کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر محمد حسن کہتے ہیں:-

" یہ بات کہی جاتی ہے ، اردو افسانے نے دوسرا
پریم چند پیدا نہیں کیا ، یہ بیان اس لحاظ سے درست
ہے کہ دیہات کی عکاسی ـــــ جو پریم چند کے افسانوں
میں ملتی ہے وہ ہمارے دور میں نایاب ہے ـــــــ
مختصر افسانہ پریم چند کو چھوڑ کر بہت آگے نکل گیا ہے -" ۲-

یہ حقیقت ہے کہ پریم چند جیسی دیہاتی زندگی کی تمام جزئیات کرشن چندر کے یہاں بھی نہیں ملتیں - لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ اس تاریک سیارے کے نغمہ سے یکسر نا آشنا ہوں - انکا طویل افسانہ " زندگی کے موڑ پر " اس میں وسطی پنجاب کے ایک قصبہ کی تصویر کشی کی گئی ہے - قصباتی پس منظر کو لیکر زندگی ، عشق کی خود کشی ، شادی ، برہمن نظام اور اس سے متعلق تمام مسائل پیش کئے گئے ہیں - اس افسانے کو پریم چند کے کسی افسانے کے مقابلہ میں تو نہیں لایا جاسکتا لیکن اس کی انفرادیت سے بھی انکار ممکن نہیں ـــ

۱- ان داتا (مجموعہ) - کرشن چندر - راجیو پرکاشن ، نئی دہلی - ص ۹۲

۲- جدید اردو ادب - ڈاکٹر محمد حسن - ص ۱۳ ، نومبر / ۱۹۷۵ء

کرشن چندر کے افسانوں میں رومانویت کی کئی شکلیں ملتی ہیں ـــ ایک کردار کی شکل میں جو کہ فلسفیوں کی طرح سوچتے ہیں اور بات بات پر تقریر کرتے ہیں - مثال کے طور " موبی " کا ایک کردار ہی کو لیجئے :-

" اسی لئے تو وہ اکثر سائکل لئے سڑکوں پر اکیلا چکر
کاٹتا نظر آتا ہے - اسٹوڈیو کے سامنے سے وہ کئی بار
گزر چکا ہے لیکن اسٹوڈیو کے اندر جانے کی خواہش
رکھتے ہوئے بھی اس نے اس خواہش کو ہر بار اپنے دل
میں دبادیا تھا پھر بھی یہ خواہش بار بار ابھرآتی تھی ـــ
قبر جتنی گہری ہو ، خواہش اسقدر بے چین ہوتی ہے -
ـــــــ نہ جانے گور میں مردوں کا کیا حال ہوتا ہوگا ،
کرسمس کے دن تو خود " موبی " کی حالت مردوں سے
بدتر تھی ـــ اس قدر پریشان آوارہ کھویا کھویا سا
وہ محسوس کر رہا تھا دوبارہ اسٹوڈیو کے سامنے سے گزرا
اور ایک نگاہ ڈالکر گزر گیا ـــ "

یہ کردار سڑکوں پر تنہا سائکل پر آوارہ گھومتا نظر آتا ہے اور قبر کی گہرائی سے خواہش کی گہرائی کا مقابلہ کرتا ہے ـــ

دوسرے قسم کی رومانویت مناظر قدرت کے بیان میں پائی جاتی ہے ـــ کرشن چندر کے افسانوں میں جگہ جگہ منظر کشی کا بیان ملتا ہے - افسانہ کا کردار خواہ وہ نچلے طبقہ کا گھرانے (پنچلّی ! چلانے والا) جرلہ ہی کیوں نہ ہو مگر

اس کے یہاں بھی ایک شاعرانہ دل پایا جاتا ہے ۔ان کے ایک افسانہ " جرا اور جری " میں (جس میں تقسیم ہند کا ہلکا سا عکس ہے) اگرچہ دو معصوم دلوں کے عشق کا بیان ہے مگر ہر جگہ زبان شاعرانہ نظر آتی ہے —

" جرا جری کا شانہ پکڑ کر گھراٹ کے باہر لیے گیا جہاں
گھراٹ کا پانی پنچکی سے نکلکر آبشار بناتے ہوئے
ٹھنڈی کول کی صورت میں دور تک بہتے ہوئے بیچ
ندی میں جاسکتا تھا ۔یہاں پر جنگلی سونف ، ہینگ اور
جنگلی دھتورے کی جھاڑیاں تھیں ۔جری کے نتھنوں
میں پہلے تو جنگلی سونف کی خوشبو آئی پھر دھتورے
کے پھولوں کی کڑوی خوشبو آئی پھر جب جری نے اسکا
ہاتھ پکڑ کر اس کے خون آلود ہاتھ کو کول کے ٹھنڈے پانی میں
ڈال دیا تو اس کے دل و دماغ پر ایک عجیب خوشبو چھاگئی
جو میٹھی بھی تھی اور کڑوی بھی ——نشیلی اور غنودگی آمیز
تھی ۔ایسی خوشبو آج تک اس کے ذہن پر کبھی نہ چھائی
تھی ۔فرط جذبات سے اسکی آنکھیں بند ہونے لگیں اور
اس کے احساسات کے بند ڈھیلے ہونے لگے — "

راجندر سنگھ بیدی کے کردار ، ماحول اور پلاٹ منٹو ، کرشن چندر ، عصمت ، سب سے مختلف ہیں ۔اب افسانہ نگاروں کے مقابلہ میں بیدی نے کم لکھا ہے۔ "اپنے دکھ مجھے دیدو" کی شاہکار کہانی " لاجونتی" ہے ۔جسکا موضوع تقسیم ہند ہے ۔دوسرا اہم افسانہ " اپنے دکھ مجھے دیدو" ہے ۔اردو افسانہ میں عشق ، سماج ، مذہب سیاست اور پھر ان سب کی کمزوریاں بار بار دہرائی جاتی رہی ہیں ۔لیکن کسی نے گھر کے اندر کی پرسکون زندگی پر توجہ نہیں دی ۔۔۔ عصمت کے کردار اگرچہ گھر کی چہار دیواری میں پائے جاتے ہیں مگر سب کی سب جنسی یا ذہنی طور پر مریض دکھتے ہیں ۔لیکن اسی ہندوستان میں لا تعداد گھر ایسے بھی ہیں جہاں شوہر ، بیوی اور بچے ہنسی خوشی زندگی گزار رہے ہیں ۔ گھر کی چھوٹی چھوٹی مسرتیں ، انکی زندگیوں میں ہر لمحہ ہوتی ہیں ——— بیدی کے افسانوں کا موضوع گھر کے اندر کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں و غم ہیں " اپنے دکھ مجھے دیدو" کا ماحول اسکی اچھی مثال ہے ۔یہاں عورت ایک با وفا گھریلو عورت کے روپ میں اپنی تمام تر ظالمانہ سپردگی کے ساتھ نظر آتی ہے جہاں اسے پہلے دن سے شوہر کے دکھوں کو اپنانے کا حوصلہ ہوتا ہے ۔یہ عورت ہندوستان کی جاہل عورت ہے مگر ساتھ ہی ذہین بھی ۔۔اسے اچھی طرح جینے کا سلیقہ معلوم ہے ۔وہ اپنی تمام زندگی شوہر کو خوش کرنے میں گزارنا چاہتی ہے لیکن وہ بھی شوہر سے کچھ چاہتی ہے ۔جسے ایک مدت تک دل کے اندر رکھے رہتی ہے ۔ " کاش اسکا شوہر بھی کبھی اس سے کہتا اپنے سکھ مجھے دیدو" بیدی کے موضوع محدود ہیں جسکا اعتراف پروفیسر محمد حسن نے اس طرح کیا ہے:۔

" ان کا سفر ایک بھولے بچہ سے شروع ہوا تھا اور اس سے

بھی زیادہ بھولے بچہ پر ختم ہو گیا اور افسانوی
کائنات کا اختتام اسی مرد عورت اور بچہ کی تکون
پر ختم ہو گیا ۔جس سے زندگی کا آغاز ہوا تھا ۔" ۱۔

لیکن ان محدود موضوعات میں افسانے کے فن کا اہتمام ہر جگہ موجود ہے ۔افسانہ کی زبان ، ان کے کردار ، اور پھر سماجی شعور ، ہر افسانہ کو اہمیت دیتا ہے ۔ان کے افسانوں کی اسی خوبی نے فسادات پر لکھے گئے تمام افسانوں میں "لاجونتی" کی انفرادیت کو اتنی اہمیت دی ——

حیات اللہ انصاری :۔ ان کے افسانوں کی ایک بڑی خوبی لطیف توازن اور سنجیدہ ظرافت ہے ۔اسکے افسانوں میں کسی طرح کا الجھاؤ نہیں ہے اور نہ ہی ان کے یہاں کرداروں کی بھیڑ ہے ۔کردار کے ساتھ ساتھ اسکا پورا ماحول پڑھنے والے کے سامنے رہتا ہے " بہت ہی با عزت" بظاہر ایک خاکہ ہے مگر چچا جان کا کردار پورے سماج کے کھوکھلے پن کو سامنے لاتا ہے —— یہ کردار دیکھنے میں ایک با عزت شخص کے تمام لوازمات سے آراستہ نظر آتا ہے ۔مگر اسکی زندگی صرف اپنے مفاد کے ارد گرد گھومتی رہتی ہے خواہ اس سے بڑا قومی اور انسانی نقصان ہی کیوں نہ ہو ——
افسانہ کی سب سے بڑی خوبی اسکی تکنیک ہے جو ایک ایسے کردار کی زبانی بیان کیا گیا ہے جو چچا جان کا نام اور ان کے تمام اعمال کو بڑی عزت سے بتاتا ہے وہ خود اپنے طنز سے بے خبر ہے —— " حوروں کا کارخانہ" بھی ان کے افسانوں میں

۱۔ عصری ادب ، نگراں ۔ڈاکٹر محمد حسن ۔دسمبر / ۱۹۷۰ء

قابل ذکر ہے ۔اس افسانہ کا ایک کردار ادیب ہے جو ایک ہوٹل میں سکون سے اپنے مسوّدہ پر نظر ثانی کی غرض سے پبلشر کے خرچ پر قیام کرتا ہے اور ایک بچہ کے رونے کی آواز سے پریشان ہوجاتا ہے ۔لیکن جب وہ بچہ کو اچھی طرح سمجھ لیتا ہے اس کے اکیلے پن اور تنہائی سے باخبر ہوجاتا ہے پھر اسے نیچے کی منزل میں کارخانے کا شور بھی اسے ڈسٹرب نہیں کرپاتا ۔دوسری طرف اس بچہ کی زندگی جسکی ماں جائز نا جائز طریقہ سے صبح سے رات تک پیٹ کی فکر میں رہتی ہے بچہ کا باپ اس عورت کو پہلے ہی طلاق دے چکا ہوتا ہے ۔ظاہر ہے کہ اس طرح بچہ کیسے خوش رہ سکتا ہے ۔وہ ادیب کی محبت پاکر رونا چھوڑ دیتا ہے ۔بمبئی جیسے ہنگامی شہر میں جہاں خود ماں باپ اپنی خارجی مصروفیت کے باعث بچہ کی پرورش و پروافت سے یکسر بے فکر نظر آتے ہیں ۔ایسے شہر میں ایک فرد ، یعنی ایک بچہ کی زندگی کو مندرجہ ذیل اقتباس سے سمجھا جاسکتا ہے :-

" بچے کی زندگی تھی واقعی بہت افسوسناک
صبح تڑکے اسکی ماں چلی جاتی تھی اور ساڑھے دس
یا گیارہ بجے رات تک واپس آتی تھی ۔دن میں تین مرتبہ
اسکو نوکر آکر کھانا کھلاجاتا تھا ۔جب نوکر بازار جاتا تھا
تو بچے کو کمرے میں اندر سے بند کرجاتا تھا کہ وہ
سڑک پر نہ نکل جائے اور گم نہ ہوجائے ۔بمبئی کی زندگی
کچھ ایسی ہے کہ وہاں ایک فلیٹ کے رہنے والوں کو پڑوس
سے کوئی غرض نہیں ہوتی ہے ۔اس لئے پڑوس میں یا تو بچے تھے
ہی نہیں یا تھے بھی تو ان پڑوس کے بچوں سے ملنے کی
اجازت نہیں تھی ۔اس طرح ننھا منا لارنس اپنی زندگی

ایسا شخص ہوں جسکے لئے کسی قسم کی پرانی
اقدار ، شرافت ، اصول پرستی وغیرہ کے تصورات
لایعنی ہوچکے ہیں —" ۱۔

یہ کردار خود کو زندہ لاش تو تصور کرلیتا ہے مگر اس دنیا اور اس میں بسنے والے لوگوں کو اچھی طرح سمجھ لیتا ہے ۔اپنے تجربات کا اظہار وہ ان الفاظ میں کرتا ہے —

" آج کی دنیا ایک بہت عظیم الشان بلیک مارکٹ ہے
جسمیں ذہنوں ، دماغوں ، دلوں اور روحوں کی اعلی
پیمانے پر خرید و فروخت ہوتی ہے ۔بڑے بڑے فنکار ،
دانشور عینیت پسند اور خدا پرست میں نے اسی
چور بازار میں بکتے دیکھے ہیں ۔میں خود اکثر
انکی خرید و فروخت کرتا ہوں — " ۲۔

تمام افسانے میں جاگیردارانہ تمدن کا زوال اور ایک نئے صنعتی نظام کا وجود بڑی آہستہ خرامی سے ظاہر ہوا ہے ۔ جمشید کا کردار اس نئے نظام کے ساتھ خود بھی بدلتا رہا ہے ۔اسکی ابتدا کی زندگی میں جاگیردارنہ طاقتیں سارے سماج پر حاوی تھیں ۔اور جمشید اس سماج کا ایک کمزور فرد تھا ۔ یہی کمزور فرد افسانے کا مرکزی کردار ہے اور سارا افسانہ اسی کے ارد گرد گھوما ہے —

افسانے کا دوسرا اہم کردار بسنتی بیگم کا ہے جس کے یہاں حالات سے

۱۔ پت جھڑ کی آواز ۔قرت العین حیدر ۔ ص ۳۳۲ ۔ ۱۹۷۵ء

۲۔ پت جھڑ کی آواز ۔قرت العین حیدر ۔ ص ۳۳۲ ۔ ۱۹۷۵ء

قید تنہائی میں کاٹ رہا تھا اس کے پاس کھلونوں
اور مٹھائی کی کوئی کمی نہیں تھی ۔لیکن اسے
ان چیزوں کی نہیں ساتھی کی ضرورت تھی ۔اور
وہ اس کے پاس صرف ایک تھا پخی میں ۔۔۔۔۔۔۔" ۱۔

اس افسانے کی کردار نگاری قابل توجہ ہے ہر کردار کی سچی تصویر پڑھنے والے کے ذہن میں نقش ہوجاتی ہے زبان سادہ ہے ۔ بچہ کی نفسیات بڑی خوبی سے بیان کی گئی ہے ۔

قرۃ العین حیدر نے اپنے افسانوں کے موضوعات اونچے طبقہ سے لئے ہیں ۔ اس طبقہ کی عکاسی جس طرح انھوں نے اپنے افسانوں میں کی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ماحول انکا دیکھا بھالا ماحول تھا ۔یہ طبقہ انگریزوں کے وقت میں جاگیرداروں ، زمینداروں ، سرکاری عہدہ داروں کا طبقہ تھا جسکی زندگی عوام سے بکسر مختلف تھی ۔قرۃ العین حیدر کے یہاں نہ صرف اس طبقہ کی تصویر کشی ملتی ہے بلکہ ایک ذہین اور حساس نقاد کی طرح وہ اس زندگی کے کھوکھلے پن پر بھی نظر ڈالتی ہیں ۔انکے افسانے ایک وسیع کینوس پر پھیلے نظر آتے ہیں ۔انکے کرداروں میں وقت اور حالات کے ساتھ بدلتے رہنا صاف نظر آتا ہے ۔یہ کردار زیادہ پڑھے لکھے اور ذہین ہوتے ہیں ۔اورشاید اسی لئے وہ بدلتے ہوئے صنعتی نظام کا ساتھ دیتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔عورت کا کردار ہوٹلوں اعلی سوسائٹیز میں ادبی سیاسی اور فلسفیانہ بحثیں کرتا نظر آتا ہے ۔۔افسانہ کی سب سے بڑی خوبی انکے

۱۔ شکستہ کنگورے ، حیات اللہ انصاری ۔ص ۸۲۔ ۸۴ ۔ ۱۹۵۲ء

یہاں کردار نگاری کی بصیرت ہے ——— جسکی مثال انکے کامیاب افسانے "ہاؤسنگ سوسائٹی" میں جمشید کے کردار میں دیکھی جاسکتی ہے اس افسانہ میں ایک طرف چھوش پشیا کے ماحول کی شان و شوکت ہے اور دوسری طرف جمشید کے گھر کا پسماندہ ماحول ——— جمشید کے کردار میں ابتدا ہی سے دونوں ماحول کا آسماں و زمین کا فرق کھٹکنے لگتا ہے اور اسمیں ان بلندیوں کو چھولینے کے حوصلے پائے جاتے ہیں ——— وہ سوچتا ہے ———

"جی توڑ کر محنت کریگا ۔فرسٹ ڈویژن لائے گا ۔مقابلے
کے امتحان پاس کرے گا اور ایک دن اس کے نام کے آگے
لکھا جائے گا —— ایس۔جے ۔علی ۔آئی ۔سی ۔ایس" ۔۱

جمشید ترقی کے راستوں پر گامزن تھا کہ تقسیم ہند کا واقعہ پیش آگیا ۔اور وہ کراچی پہنچ گیا ۔اور صرف ڈیڑھ سال کی مدت میں کراچی کی نئی دنیا میں اس کے قدم مضبوطی سے جم گئے ——جمشید دولت ، عزت ، شہرت سبھی جاگیردارانہ قدروں کو حاصل کرلیتا ہے مگر خود اسکا ضمیر بک جاتا ہے ۔ اسکے سچے جذبات کاروباری ہوجاتے ہیں ۔اور یہاں تک وہ اپنے آپکو ایک زندہ لاش تصور کرنے لگتا ہے —

"میں نے اپنی لاش کا خود پوسٹ مارٹم کیا اور اسے
زندگی کے مردہ خانے میں برف کی سلوں تلے دبادیا ——
———— میں ایک انتہائی ذلیل ۔بے رحم ۔
خود غرض کمینہ اور مفاد پرست انسان ہوں ۔میں ایک

۱۔ پت جھڑ کی آواز ۔قرت العین حیدر ۔ ص ۲۴۲ ، ۱۹۶۵ء

مقابلہ کرکے آگے بڑھنے کی ہمت ہے -وہ خود کچھ کرنا چاہتی ہے اور اسی لئے اپنی ماں بوٹا بیگم سے کہتی ہے —

" میں تیرہ برس کی عمر سے دھکے کھا رہی ہوں -سات سال سے ہم لوگ اس محل میں رہ رہے ہیں -مجھے مفت کے ٹکڑے توڑتے اب شرم آتی ہے -مجھے سوا سو ماہوار کی نوکری مل گئی ہے -شام کے وقت میں ٹیوشن بھی کرونگی اور شہر میں مکان لیکر رہوں گی-" ۱-

بوٹا بیگم جو کہ تعلقدار کی زیادتیاں جھیل چکی تھی اور اب انکے پاس اپنی اس لڑکی کے مستقبل کی فکر کے سوائے کچھ سوچنے کے لئے نہیں تھا -وہ پھر تنہائی سے گھبراتی ہیں مگر اب بسنتی بیگم کے پاس نئے مستقبل کے درخشاں خواب تھے جہاں اسکی بھی کوئی منفرد شخصیت تھی —اسکول میں پڑھنے والی یہ لڑکی بچپن ہی سے آتی ترچھی تصویروں کے ذریعہ اپنے شہزادی بننے کے خواب دیکھا کرتی تھی- اور جب اسکول میں آرٹ کا پہلا سو روپیہ کا انعام بسنتی بیگم کو ملتا ہے تو جیسے اچانک اسمیں بلا کا عزم پیدا ہوجاتا ہے -وہ پہلی بار سوچتی ہے —

" میں وہ بسنتی بیگم نہیں ہوں جسے نواب بھورے کے سپاہی اٹھاکر لے گئے تھے اور دوسری بات یہ کہ میں اکیلی نہیں ہوں ملک کے سارے عوام سارا محنت کش طبقہ میرے ساتھ ہے —" ۲-

---

۱- پت جھڑ کی آواز -قرت العین حیدر -ص ۲۵۲ ، ۱۹۷۵ء مکتبہ جامعہ -دہلی-

۲- پت جھڑ کی آواز -قرت العین حیدر -ص ۲۵۲ ، ۱۹۷۵ء مکتبہ جامعہ -دہلی-

اس طرح بسنتی بیگم اپنی ماضی کی تلخ یادیں جو اس نام سے وابستہ تھیں بدل دیتی ہیں اور نئے سرے سے زندگی گزارنے کے لئے اپنے اصلی نام میں ثریا حسین سے اپنے آپ کو متعارف کراتی ہیں ——–اس کردار کی نفسیات کا بڑا خوبصورت تجزیہ افسانہ میں ملتا ہے –وہ جیسے جیسے اس سرمایہ دار طبقہ کا زوال دیکھتی ہے اسے ایک طرح کا دلی سکون ملتا ہے –تقسیم ہند کے بعد لوگ گھر سے بے گھر ہوئے اور ان کی خبریں ریڈیو سے سنی جاتی تھیں –ثریا کو سب سے زیادہ فکر و پریشانی اس گھر کی خیریت کی ہوتی ہے جو سرمایہ داروں کا نمائندہ تھا اور ایک مدت تک اسکی پناہ میں ثریا نے زندگی گزاری تھی اور طرح طرح کی ذہنی و جذباتی پریشانیوں کا سامانا کیا تھا ––سلمان جو اسی سرمایہ دار طبقہ کا اکلوتا بیٹا تھا خود ذہنی طور پر اس نظام کا مخالف بھی تھا ––ثریا سے اسکی ذہنی رفاقت تھی اور مکمل جذباتی ہم آہنگی تھی ––ثریا کہتی ہے :––

" میں یہاں بیٹھ کر روز شام کو خبریں سنتی ہوں
تمہارے گھر والوں کی خیریت ابھی تک نہیں سنی"
اسکی آواز خفیف سی بے رحمی تھی —– " ۱–

افسانہ جس طرح رفتہ رفتہ آگے بڑھتا ہے اسمیں وقت کا بہاو صاف نظر آتا ہے –اس کے ساتھ نظام حیات میں جو تبدیلیاں آئی ہیں انکی رفتار کہانی میں حقیقی فضا پیدا کرتی ہے –کوئی تبدیلی کوئی واقعہ اچانک یا غیر یقینی نہیں اور اس طرح جاگیردارانہ تمدن اور نئے صنعتی نظام کے موضوع پر یہ کامیاب افسانہ ہے –

۱–پت جھڑ کی آواز –قرۃ العین حیدر –ص ۲۲۰ ۱۹۷۵ء

ایک اور افسانہ " قلندر " کا موضوع ہے " دوسرے کو شانتی دینا " —— یہی اس افسانے کا مرکزی خیال بھی ہے - اس کہانی کا مرکزی کردار اقبال ہے جو سارے افسانوی کینوس پر پھیلا نظر آتا ہے ——اس کردار کا مذہبی اخلاقی اور سماجی قانون ہے - دوسرے کو شانتی دینا خواہ اسکی کوئی بھی شکل کیوں نہ ہو - یہ کردار سب سے پہلے غازی پور گاؤں میں نظر آتا ہے پھر کانپور پہنچتا ہے اور اس سال کے بعد قسمت آزمائی کے لئے انگلستان ، کنیڈا اور امریکہ جانے کی ہوا چلی تو یہ کردار بھی لندن پہنچا ——اور یہاں سے اقبال کی تہ دار شخصیت کی عکاسی شروع ہوتی ہے ایک بچی کے ذریعہ کہانی شروع ہوئی ہے اور وہی وقت کے ساتھ ساتھ ایک عورت کی شکل میں مسلسل کہانی کے تمام واقعات کے ساتھ ساتھ رہی ہے - جسے اقبال منی کہکر پکارتے تھے اور وہی منی اقبال کی شخصیت کے مختلف روپ بھی دکھاتی ہے ——

" اقبال بھائی کو فن موسیقی - علم جیوتش - پامسٹری - ہومو پیتھی طب یونانی اور آیورویدک سے لیکر پولٹری فارمنگ - کاشتکاری اور باغبانی تک ہر چیز میں دخل تھا اور حلقہ ارباب ذوق کی محفلوں میں بلا ناغہ شرکت کرتے تھے —" ١-

یہ تمام فن اقبال کے ذاتی فن نہ تھے بلکہ جب اسکو کسی کو شانتی دینے کے لئے کسی فن کی ضرورت پڑتی وہ فن کا ماہر بن جاتا ——وہ دوسرے لوگوں سے اپنے ملک اپنے مذہب کی بھی برائیاں سن کر انجان بنا رہتا ہے - کیونکہ اسکی زندگی کا مقصد ہے انسان دوستی وہ ہر حال میں دوسرے کو خوشی دینا چاہتا ہے جس کے لئے اسے طرح طرح کے روپ بدلنے پڑتے ہیں اور خود کو ہر طرح کے ماحول میں ڈھالنا ہوتا ہے -

---

١- پت جھڑ کی آواز - قرت العین حیدر - ص ١٢٩ - ١٩٧٥ء مکتبہ جامعہ - دہلی -

قرت العین حیدر کے زیادہ تر افسانے طویل ہوتے ہیں —جو مختلف واقعات کے سہارے آگے بڑھتے ہیں -کبھی افسانہ شروع انجام سے ہوتا ہے اور فلیش بیک میں سارا افسانہ اور اسکے واقعات دہرائے جاتے ہیں "پت جھڑ کی آواز" میں یہی ٹیکنک اپنائی گئی ہے — " میں" یعنی ایک لڑکی کا کردار گھریلو کام کاج میں گھرا سامنے آتا ہے جو کار سے اترتی ہوئی ایک لڑکی کو اپنی طرف تعجب سے دیکھتے ہوئے ماضی کی یادوں میں پہنچ جاتا ہے -کار سے اترتی ہوئی یہ لڑکی کبھی اسکی کلاس فیلو بھی تھی ——— یہ لڑکی یہ کہکر چلی جاتی ہے ———

" — میں — سعدیہ ریحانہ وغیرہ جب بھی
کراچی میں اکھٹا ہوتے ہیں تمہیں برابر یاد کرتے ہیں۔" ۱-

اور یاد کیا جانے والا یہی کردار افسانہ کا مرکزی کردار ہے جو اپنا تعارف اس طرح کراتا ہے —

" میں تنویر فاطمہ ہوں -میرے ابا میرٹھ کے رہنے والے
تھے -معمولی حیثیت کے زمیندار تھے -ہمارے یہاں
بڑا سخت پردہ کیا جاتا تھا -خود میرا چچا زاد بھائی
پھوپی زاد بھائیوں سے پردہ تھا — " - ۲-

یہ سیدھا سادھا تنویر فاطمہ کا کردار وقت اور ماحول کے ساتھ ساتھ اسقدر بدل جاتا ہے کہ انکا یہ تعارف بے معنی سا لگتا ہے -اگر نفسیاتی نقطہ نظر سے ایک کردار کا تجزیہ کیا جائے تو اسکے ابتدائی ماحول کا کردار پر گہرا نقش پڑتا

۱- پت جھڑ کی آواز -مجموعہ قرت العین حیدر - ص ۲۰۹ - ۱۹۷۵ء
۲- ایضاً ایضاً ص ۲۰۹- ۱۹۷۵ء

ہے وہ ماحول کے ساتھ کچھ نہ کچھ تو بدل سکتا ہے مگر تنویر فاطمہ کی طرح بدلتی ہوئی شخصیت بلا شبہ ایب نارمل سی لگتی ہے ـــــ وہ تعلیم کے لئے علی گڑھ جاتی ہے وہاں بھی اسے ایسی لڑکیاں ملتی ہیں ایسا ماحول ملتا ہے جسے خالص مشرقی ماحول کہا جاسکتا ہے ۔مگر یہ کردار اپنے ماحول سے باہر نکل کر ایک شاندار پارٹی میں شرکت کرتی ہے ۔یہاں اسکی ملاقات خوش وقت سنگھ سے ہوتی ہے اور تبدیلی کی برق رفتاری دیکھئے کہ ـــــــــ "اس کے بعد ایک ہفتہ تک میں خوب خوب سیریس کیں ۔" ـــــــــــــــــــــــ :۔

" اس ہفتہ کے آخر تک میں میجر خوشوقت سنگھ کی مسٹریس بن چکی تھی ـــ" ۱۔

تنویر فاطمہ کی زندگی یہاں پہنچکر بھی ٹھہراؤ پیدا نہیں کرتی دونوں ایک ساتھ رہتے ہیں ۔بڑے بڑے شہروں میں گھومتے پھرتے ہیں مگر زندگی ایک ساتھ گزارنے کا سلیقہ ان دونوں کے پاس نہیں ہوتا ۔خوشوقت سنگھ ایک سال کے بعد تنویر فاطمہ سے ملا اور ساتھ ہی اپنے جگری دوست فاروق سے ملوایا ـــ اور اسکے بعد خوشوقت سنگھ تنویر سے نہیں ملا کیونکہ ـــــ " میں اب فاروق کی مسٹریس بن چکی تھی ۔" اور پھر یہ رشتہ بھی اس طرح سرد پڑ جاتا ہے ۔

" ہم لوگ اس طرح ملتے گویا بیسوں برس کے پرانے شادی شدہ میاں بیوی ہیں جن کے پاس سارے نئے موضوع ختم ہوچکے ہیں۔ اب سکون و آرام ٹھہراؤ کا وقت ہے ۔" ۲۔

۱۔پت جھڑ کی آواز ـــ قرۃ العین حیدر ۔ ص ۲۱۲۔ ۱۹۷۵ء مکتبہ جامعہ ۔دہلی ۔

۲۔ ایضاً ایضاً ص ۲۲۰ ۔ ۱۹۷۵ء ایضاً

اس شہراؤ میں تنویر فاطمہ کی ملاقات فاروق کے دوست سید وقار حسین سے ہوتی ہے ۔تنویر کی زبانی ہی کردار کا تفصیلی تعارف بھی کرایا گیا ہے اور ساتھ ہی انکا حلیہ بھی بتایا گیا ہے ۔اس کردار سے بھی میل جول بڑھا اور ایک دن ـــــــ

" پچھلے اتوار کو وقار صاحب نے ایک مولوی بلاکر اپنے
دو چرکٹوں کی گواہی میں مجھ سے نکاح پڑھوالیا۔"۱۔

اور اس طرح افسانہ کا خاتمہ تنویر افطمہ کے پہلے عاشق نما شوہر کی یاد پر ہوتا ہے ۔وہ خوش وقت سنگھ کے بارے میں سوچتی ہے کہ اب وہ کہاں اور اس حال میں ہوگا ۔مگر اب اسے یاد کرنے سے کیا فائدہ ـــــتنویر فاطمہ کے یہ جملے کہ :

" میں نے تو کبھی کسی سے فلرٹ نہیں کیا ۔خوشوقت سنگھ
فاروق ۔اور اس سیاہ فام دیوزاد کے علاوہ جو میرا شوہر ہے ،
میں کسی چوتھے آدمی سے واقف نہیں ۔میں شاید بدمعاش
تو نہیں تھی ۔نہ معلوم میں کیا تھی اور کیا ہوں۔" ۲۔

قرۃ العین حیدر قاری کو تنویر فاطمہ کی شخصیت کی کون سی تہ سمجھانا چاہتی ہیں ـــــــ شاید اس سے وہ اس نتیجہ پر پہنچ سکے کہ تنویر فاطمہ ایک بہت سیدھی سادی لڑکی تھی ۔جو ایک ایسے ماحول سے نکل کر آئی تھی جسمیں سادگی و سچائی تھی ۔یا وہ یہ سمجھ سکے کہ اس کردار کے پاس عقل کی کمی ہو جسمیں وہ مسلسل ایک کے بعد دوسرے مرد کے ساتھ رہنے لگتی ہے کہ یہاں اسے ایک ایسی

۱۔پت جھڑ کی آواز ۔قرۃ العین حیدر ۔ص ۲۲۲ ۔ ۱۹۷۵ء ۔مکتبہ جامعہ ۔دہلی ۔

۲۔ ایضاً ص ۲۲۲ ۔ ۱۹۷۵ء مکتبہ جامعہ ک دہلی ۔

زندگی ملسکے جسکی اس نے تمنا کی تھی - ایک اوسط درجہ کی کوٹھی —— سواری کے لئیے موٹر اور بس ———— لیکن ان دونوں نتیجوں کا جواب اسے تنویر فاطمہ کی ہی جگہ فکر میں ملجاتا ہے ایک جگہ وہ سوچتی ہے ——:-

" بعض اچھی خاصی بھلی چنگی اعلی تعلیم یافتہ لڑکیاں آوارہ کیوں ہوجاتی ہیں - ایک تھیوری تھی کہ وہی لڑکیاں آوارہ ہوتی ہیں جن کا ذہنی " آئی - کیو " بہت کم ہوتا ہے - ذہین انسان اپنی تباہی کی طرف جان بوجھ کر قدم نہیں اٹھائیے گا مگر میں نے تو اچھی خاصی تیز طرار لڑکیوں کو لوفری کرتے دیکھا ہے دوسری تھیوری تھی کہ سیر و تفریح عیش و آرام کی زندگی قیمتی تحائف کا لالچ - رومان کی تلاش ایڈوینچر کی خواہش - یا محض اکتاہٹ - یا پردے کی قید و بند کے بعد آزادی کی فضا میں داخل ہوکر پرانی اقدار سے بغاوت ————

اس صورت حال کی چند وجوہ ہیں یہ سب باتیں ضرور ہونگی ورنہ اور کیا وجہ ہوسکتی تھی ؟ -" ا-

اگر دوسری تھیوری تنویر فاطمہ کی تباہی کی وجہ بنتی تو پھر اسے یہ اندازہ کیوں نہیں کہ وہ کیا تھی اور کیا ہوگئی ———— اسے اپنے کئے پر پشیمانی بھی نہیں بلکہ جب وہ اپنی پچھلی زندگی کا جائزہ لیتی ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ

پت جھڑ کی آواز - قرت العین حیدر - ص ۲۱۲ - مکتبہ جامعہ - دہلی -

اس نے کسی سے فلرٹ نہیں کیا اور وہ کسی چوتھے آدمی کو جانتی بھی نہیں ——

خوش وقت ۔فاروق ۔اور وقار حسین یہ تینوں کردار ایسے ہیں جن سے تنویر فاطمہ کو نہ جذباتی لگاؤ ملا اور کسی طرح کی بھوک اس سے ذہنی ہم آہنگی ملی —— یہ تینوں کاروباری آدمی تھے جو اپنے کاروبار میں مختلف شہروں میں رہتے اور گاہے گاہے تنویر سے ملتے رہتے ——— قرت العین حیدر کو چونکہ افسانہ بیان کرنے پر قدرت ہے اسلئے ایک کردار کے ذریعہ اسکی ایب نارمل زندگی اس طرح بیان کی ہے کہ قاری کہانی کے انجام تک پڑھنے میں اکتاہٹ یا الجھن محسوس نہیں کرتا مگر وہ خود کسی فیصلہ پر پہنچنے سے رہ جاتا ہے ۔اس کردار کی زندگی میں کوئی ایسے حالات پیش نہیں آئے جن سے قاری اسے معاف کرسکے اور اس سے ہمدردی دے سکے ۔وہ مجموعی طور پر صرف اس نتیجہ پر پہنچتا ہے —— اونچی سوسائٹی اعلی تعلیم اور لڑکی کی ضرورت سے زیادہ آزادی اسے گمراہ کردیتی ہے ——

—— xxx ——

موضوعات کی تبدیلی ۱۹۵۰ء کے بعد

رتن سنگھ :-

رتن سنگھ نے جنس و رومان اور سیاسی و ہنگامی حالات سے دامن بچاکر زندگی میں پیش آنے والی چھوٹی چھوٹی باتوں سے اپنے افسانوں کا تانا بانا بنا ہے ۔انکے یہاں ایسے کردار نظر آتے ہیں جو سماج میں روز مرہ کی زندگی میں دیکھے جاتے ہیں۔ وہ صدیوں سے غربت ، افلاس، تنگدستی کو دور کرنے کی فکر میں ہیں ۔وہ محنت کرتے ہیں زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے ہر طرح کی جدو جہد کرتے ہیں مگر پھر بھی وہ اپنے چھوٹے سے خاندان کی ضروریات بہ آسانی پوری نہیں کرپاتے ۔

" تھکے ہوئے لمحے " رتن سنگھ کی ایک ایسی ہی کہانی ہے جسمیں باپ اپنی بچی " رانی " کی صرف ایک چھوٹی سی گڑیا لانے کی فرمایش بھی پوری نہیں کرپاتا ۔ وہ اپنے اقتصادی حالات کا جائزہ لیتا ہے اور اداس ہوجاتا ہے ـــــاور اپنی زندگی کی تمام محرومیوں کو یاد کرنے لگتا ہے ۔اچانک دروازے پر دستک ہوتی ہے اور پڑوس کی کچھ عورتیں آتے ہی اسکی بیوی کے ہاتھوں میں دو سو روپیہ تھمادیتی ہیں × جو کمیٹی میں نکلے ہوتے ہیں ۔یہ صرف دو سو روپیہ سوگوار ماحول کو خوشیوں میں بدل دیتے ہیں ـــــــ یہ فکروں سے بے نیاز وقت اتنی جلدی اور آسانی سے گزرتا ہے کہ کچھ اندازہ بھی نہیں ہوتا ـــــ

" اور میں نے سوچا کہ دکھ کا وقت تو کاٹے نہیں کٹ رہا تھا
پہلے تین منٹ بیٹھے ہوئے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے

× (پیسہ جمع کرنے کی ایک اسکیم)

تین صدیاں بیت گئی ہوں اور اب پتہ بھی نہیں چلا تھا
کہ تین گھنٹہ بیت گئے ۔" ۱۔

ایسے دکھوں میں نہ جانے کتنی زندگیاں گھٹ رہی ہیں جو رتن سنگھ کی توجہ کا مرکز تھیں ۔اسی لئے انکے موضوعات انسان کی زندگی کی چھوٹی چھوٹی پریشانیاں تھیں ۔جو خود انکے تجربات کا عکس معلوم ہوتی ہیں۔ وہ جس چہرے پر نظر ڈالتے ہیں انہیں بھوک کی زردی ۔درد کا پسینہ اور مجبوری کا نقش نظر آتا ہے اور اس طرح ہزاروں چہروں کو پڑھتے ہیں اور ہر جگہ انہی دکھ درد بھوک افلاس کی شکلیں نظر آتی ہیں ——— " ایک پرانی کہانی " میں انہوں نے ایک اتنی پرانی کہانی بیان کی ہے جو انسانی تاریخ کی کہانی ہے ۔

" اس پیلے زرد کمزور چہرے پر بھوک تحریر تھی دوسرے
چہرے کے ماتھے سے درد پسینہ بن کر ٹپک رہا تھا تیسرے
چہرے پر اسکی مجبوری نقش تھی ۔پھر چوتھا چہرہ پڑھا
پھر پانچواں پھر دسواں ۔پھر ہزاروں چہرے ایک کے بعد ایک
تیزی سے میرے گرد گھومنے لگے سب چہروں کی تحریریں
پڑھتے پڑھتے انکے دکھ درد کے احساس سے روح لوز
گئی اور مجھے ایک پرانی کہانی یاد آنے لگی ۔" ۲۔

اور وہ کہانی یہ تھی :۔

" ایک دفعہ ایک غریب آدمی کو فاقوں کی نوبت آگئی ۔
پوری محنت کے باوجود اسے اور اسکی بیوی کو پیٹ بھر

۱۔پہلی آواز ۔رتن سنگھ ۔ ص۲۱ ۔نظامی پریس ۔نومبر ۔ ۱۹۶۹ء
۲۔ پنجڑے کا آدمی ۔رتن سنگھ ۔ ص ۱۲۸ ۔ نامی پریس۔ دسمبر ۔ ۱۹۷۲ء

روش نصیب نہیں ہوئی تھی دن بدن وہ کمزور ہونے لگے - انکے
چہرے بھی زرد پڑ گئے اور ان پر بھوک - درد اور مجبوری موٹے
موٹے لفظوں میں تحریر ہوگئی —"۱-

انکی اس تحریر کو کوئی نہ پڑھ سکا اور نتیجہ ——— موت نے ان دونوں
کو اپنی پناہ میں لے لیا - افسانہ نگار کے ارد گرد کتنے ہی ایسے چہرے ہیں اور وہ
انکی اس گرتی ہوئی حالت کو سدھارنے کی فکر میں ہے —

ایک افسانے " واپسی " کا کردار نوکری کے لئے اس قدر پریشان ہوچکا ہے
ہوتا ہے کہ جیسے اب اسے فکر کے سوا باہر کی دنیا سے کوئی واسطہ نہ ہو وہ کافی ہاؤس
میں بیٹھا سارے ہنگاموں سے بیگانہ بے جان چیزوں کو دیکھے جا رہا تھا - کبھی کافی
ہاؤس کی کرسیوں اور بیٹھے ہوئے لوگوں کو گنتا ہے اور کبھی ایک تصویر جس میں ایک
لڑکی کافی پیتی ہوئی بڑی خوش نظر آرہی تھی ——— اس بیچ میں کئی ایسے موقع
آئے جو اسے اٹھنے کے لئے مجبور کرتے مگر وہ ان سب سے بیگانہ اپنے خیال میں کھویا
رہا — اسمبلی کے سیشن کا ذکر آیا تو اس نے لا پرواہی سے کہ دیا - کوئی سرکار
رہے مجھے اس سے کوئی سر و کار نہیں — جلوس نکلا اسنے یہ جاننے کی بھی کوشش
نہیں کی کہ وہ کیا چاہتے ہیں - یہاں تک گھر سے خبر آئی ماموں آئے ہیں گھر پر بلا
رہے ہیں شام کو واپس بھی جارہے ہیں مگر جیسے اسنے کچھ بھی نہ سنا ہو - ایک اور
بری خبر آئی ایک قریبی دوست کو حادثہ پیش آگیا تھا جسمیں اسکو شدید چوٹ لگی
تھی وہ اب بھی خاموش رہا ——— اور پھر شام کے چھ بجے کے بعد جب اس کے بھائی
نے آکر خبر دی کہ بھیا آپکو نوکری مل گئی ——— اس خبر نے جیسے اس کے رگ و پے

۱- پنجرے کا آدمی - رتن سنگھ - نامی پریس - دسمبر - ۱۹۷۲ء

میں خوشیوں کی لہر دوڑا دی ۔وہ کلکتہ میں انٹرویو دیکر آیا تھا اور اب اسکا وہاں سے بلاوا آیا تھا ـــــاب جیسے اسکی تمام فکروں کا خاتمہ ہوگیا ۔وہ فوراً دوست دیکھنے ہسپتال چل پڑا ماں کو روکنے کی خبر گھر کھلادی اور دوست سے معلوم کرنے لگا اسپتال میں کیا ہوا ؟ ـــــــــــ

اس افسانے کا موضوع آج کے نوجوانوں کی سب سے بڑی دشواری نوکری کی تلاش ہے ۔جسکے لئے وہ ایک مدت تک پریشان رہتا ہے ۔اور نوکری مل جانے پر وہ ایک بہت بڑی فکر سے بیگانہ ہوجاتا ہے ـــــ

" اپنے جیسا " افسانہ ایک ایسے انسان کی کہانی ہے جس میں وہ تمام برائیاں ہیں جو ایک عام آدمی میں پائی جاتی ہیں لیکن پھر بھی اسکی میٹھی زبان کی وجہ سے دفتر کے سب ہی لوگ اسکی تعریف کرتے ہیں ۔جس کردار کی زبانی کہانی بیان کی گئی ہے اسے اچھی طرح معلوم ہے پر انسان میں کچھ نہ کچھ خامیاں ضرور ہوتی ہیں مگر شاید انسان اپنی اچھائیوں کی چادر کے نیچے ان خامیوں کو چھپائے رہتا ہے اسی لئے دل ہی دل میں یہ کردار اسکی تعریفوں سے چڑھنے لگتا ہے اور مستقل اس فکر میں رہتا ہے کب اسکی کوئی کمزوری ملے اور وہ اسے دوسروں کے سامنے رکھتے ۔ آہستہ آہستہ اسکی شرافت کی تصویر خود دھندلی ہونے لگی کسی نے بتایا کہ اس نے اس طرح شراب پی جیسے وہ پرانا شرابی ہو ۔اس کے بعد جوا کھیلنے کا انداز بتاتا ہے جیسے وہ بہت بڑا جواری ہو ـــــــــ ایک دن یہ دونوں کردار آپس میں گھل مل جاتے ہیں ـــــوہ اپنی تمام برائیوں کو خود بتاتا ہے ۔بچپن میں اسے چوری کرنے کی عادت تھی اور اب بھی وہ بڑا لالچی ہے مطلبی ہے اور اسی لئے وہ کسی کی مدد کم ہی کرپاتا ہے ـــــکہانی بیان کرنے والا کردار اطمینان کی سانس لیتا ہے اور

سوچتا ہے ———

" جب وہ اپنی خامیوں کے بارے میں بتا رہا تھا میں نے
ایسا محسوس کیا جیسے میرے دل سے بوجھ اتر رہا ہو -
مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ یہ تو اپنے جیسا ہی ہے -
اسی لئے اس وقت وہ مجھے بڑا اچھا لگا - میرے دل میں اس
کے لئے چھپی نفرت دھل گئی" - ۱ -

لیکن اس کردار کی خامیوں کے سامنے آتے ہی تعریف کرنے والوں کی رائیں بدل جاتی ہیں اور وہ اسے کھوکھلا انسان کہنے لگتے ہیں ——— مگر افسانہ بیان کرنے والا پہلے سے بھی زیادہ اسکی عزت کرنے لگتا ہے کیونکہ وہ یہ جان جاتا ہے کہ یہ تو "اپنے جیسا" ہی نکلا ———

رتن سنگھ کے افسانوں میں زندگی کی حقیقت کی تلخیوں سے نظر بچا کر رومان کی وادیوں میں ہنستی گنگناتی نہیں پائی جاتی ہے خود انکا بیان ہے :-

" جب زندگی کی آنکھ میں آنسوں ہیں اور یہ فٹ پاتھ
پر بھیک مانگتی ہے ———————————
تب رومان کی بات کیا کی جائے -" ۲ -

زندگی فٹ پاتھ پر بھیک مانگتی ہے اور اسکی طرف کسی کی توجہ نہیں رتن سنگھ کے کتنے ہی کردار دکھ دور کرنے کے لئے محنت مزدوری کرتے ہیں اور دعائیں

———————

۱ - پنجرے کا آدمی ——— رتن سنگھ — ص ۱۱۲ - نامی پریس - لکھنؤ -

۲ - عصری ادب — ڈاکٹر محمد حسن (نگراں) ص ۱۰۷ - ادارۂ تصنیف - علی گڑھ -

کرتے ہیں ـــــ "ڈھول" افسانہ کا مرکزی خیال ہی ہے ۔جسمیں ایک کردار اکیس سال پہلے کی وہ سڑکیں یاد کرتا ہے جسکی ڈھول فٹ پاتھ پر ایک فقیر کو بوڑھا کردیتی ہے۔ لیکن اب تار کول کی پکی صاف ستھری سڑکیں نظر آرہی تھیں جن پر رنگ برنگی تیز رفتار کاریں،جیپیں ، ٹرک اور بسیں گزرتی نظر آرہی تھیں ۔ سڑک کے دونوں طرف بجلی کی روشنی تھی اور سایہ دار درختوں کی ٹھنڈک ۔چھوٹے چھوٹے بچے اسکول کی وردیوں میں نظر آرہے تھے ۔ ـــــــ مگر وہ سڑک جو گاؤں سے آتی تھی ابھی تک کچی تھی اور وہ فقیر جو اب بوڑھا ہوچکا تھا ہوتا ہے اسکی صدائیں سنائی دیتی ہیں ـــــــ

" ـــــ اس کچی سڑک کو بھی پکاّ کرو بابا ـــــــ

ہم غریبوں کے بھی دکھ ہرو بابا ـــــ" ١۔

لیکن غریبوں کا یہ دکھ دور نہیں ہوتا وہ کبھی چوری کا رستہ اپناتے ہیں کبھی رشوت خوری کی بیماری میں مبتلا ہوجاتے ہیں ـــ

ان کے افسانے " خدا کا دوست" میں ا جیت سنگھ کا کردار ایک چور کا کردار ہے ۔جس کو کوئی ذریعہ معاش سمجھ میں نہیں آتا اور وہ چوروں کے ایک گروہ کا ساتھ پکڑتا ہے ۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ چوری میں ماہر ہوجاتا ہے ۔برائی کے راستہ پر چلنے کے باوجود وہ گردوارے بھی جاتا اور چوری کی کامیابی کی دعا مانگتا چوری میں اسے جو بھی ملتا وہ اسکا ایک حصہ چڑھاوے میں دے دیتا ہے ۔بوڑھا ہوجانے پر وہ یہ دھندا چھوڑدیتا ہے اور پھر واہ گروہ کے حضور میں داخل ہوتا ہے ـــــ

١۔ پنجرے کا آدمی ۔رتن سنگھ ۔ ص ١٢٧ ۔ نامی پریس۔لکھنئو ۔ ١٩٧٣ء

" اسی لمحے اس نے دیکھا کہ جس جگہ جھک کر اس نے ماتھا
ٹیکا تھا وہاں پانچ روپیہ کا ایک نوٹ پڑا تھا جو شاید کسی
شردھالو بھگت نے چڑھایا تھا —" ۱۔

اور اس طرح وہ ہر دن گردوارے جاتا اور چڑھاوے میں سے کچھ نہ کچھ اپنی ضرورت کے لئے نکال لیتا —

اس افسانے میں افسانہ نگار نے ان انسانوں کو موضوع بنایا ہے جو پیٹ کی روش کے لئے کوئی نہ کوئی راستہ تلاش کرلیتے ہیں —سماج میں بظاہر انکا تعلق مذہب کے خلاف ہیں ——کردار کو خود اپنی برائی اندازہ ہے وہ اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ ایمانداری سے روپیہ کمائے اور اس سے اپنی زندگی کی ضروریات پوری کرے ——

" روح کا درد " افسانہ ایک ایسے رشوت خور کی کہانی ہے جو لوگوں سے ہر کام کے لئے دو چار روپیوں کی رشوت لیتا ہے ۔کسی کی چھٹی منظور کرانا ہو کسی کا تبادلہ کرانا ہو ہر جگہ اسے اوپر کی آمدنی چاہئے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر یہ اوپر کی آمدنی نہ ہو تو اسکا خرچ چلنا مشکل ہوجائے ——یہی سوچ کر وہ اسی اور سو روپیہ ماہوار پانے والوں سے دو چار روپیہ سے بھی لینے سے گریز نہیں کرتا ۔لیکن جب بھی درگا پرشاد نام کا یہ کردار تنہا ہوتا اسے اپنی زیادتیوں کا احساس ہوتا اور ایک دن اسکے اندر کا ایماندار درگا پرشاد بیدار ہوتا ہے اور وہ کبھی نہ رشوت لینے کا ارادہ کرتا ہے ۔الگو نام کا ایک کردار اپنی چھٹی لینے آتا ہے اور وہ یہیں سے ایمانداری شروع کرنے کا ارادہ کرتا ہے ——

" الگو اپنی چھٹی لیکر چلا گیا ہے ۔لیکن میری مٹھی میں

۱۔پنجرے کا آدمی ۔رتن سنگھ ۔ ص ۱۳۸ ۔ نامی پریس ۔لکھنئو ۔ ۱۹۷۳ء

یہ دو روپے کا نوٹ کہاں سے آگیا ——— میں اپنی مٹھی بند
کیوں کئے ہوں ؟ میں اپنی انگلیوں کو توڑ کیوں نہیں دیتا —
اپنی مٹھی کو کاٹ کیوں نہیں لیتا ——— لیکن یہ کروں کیسے ؟
میں تو مردہ ہوں ——— مردہ ——— ٹھنڈی لاش جو کچھ
نہیں کرسکتی —" ۔۱۔

اس کردار کی ذہنی حق و باطل کی جنگ کا انجام باطل کی فتح ہوتا ہے ۔ وہ حق کے راستے پر چلنا چاہتا ہے مگر خود اسکے حالات اسے اس راستہ سے ہٹنے نہیں دیتے اور وہ الگو سے روپیہ لیکر محسوس کرتا ہے جیسے اسکا وجود ٹھنڈی لاش ہے جو اگر چاہے بھی تو اپنی برائیوں کو جڑ سے نہیں اکھاڑ سکتا —

روزی روشن کے چکر کے علاوہ بھی رتن سنگھ نے کچھ اور موضوعات لئے ہیں جسمیں اس نے کردار کا نفسیاتی تجزیہ بڑی خوبصورتی سے کیا ہے — " مریم " اس سلسلے میں قابل ذکر ہے ——" مریم "بیڈ نمبر ۲ کے ایک چڑچڑے اور تنہائی سے اکتائے ہوئے مریض کی کہانی ہے ——جو خود اپنے سونے پن سے تنگ آچکا ہوتا ہے اور دوسرے مریضوں کی دلجوئی کرنے والوں سے نفرت کرنے لگتا ہے ۔لیکن جب ایک دن پاس کے مریض کے رشتہ داروں میں آئی ہوئی ایک لڑکی اس کا اکیلا پن دور کردیتی ہے تو نہ صرف اسکی تنہائی ختم ہوتی ہے بلکہ آہستہ آہستہ اسکا مرض بھی دور ہوجاتا ہے ۔اور اس طرح ایک بچی اس مریض کو سماجی اور اجتماعی مطابقت سے دو چار کرتی ہے ۔

۱۔ پنجرے کا آدمی ۔رتن سنگھ ۔ ص۱۵۱ ۔ نامی پریس ۔لکھنئو ۔ ۱۹۷۲ء

" پندرہ دن کے اندر ہی اندر جس بجاج کی زندگی سے
ڈاکٹر نا امید ہوگئے تھے وہ پشاش بشاش تندرست ہوکر
وارڈ سے گھر کی طرف جا رہا تھا ۔جاتے ہوئے اس
نے ننھی لڑکی کے ماتھے کو چوما ۔اسے پیار کیا جہاں
اسے صحت مند ہونے کی خوشی تھی وہاں اسے غم بھی تھا کہ
اب وہ اس ننھے فرشتے سے بچھڑ رہا ہے جس نے اسے نئی
زندگی بخشی تھی ۔" ۱۔

رتن سنگھ کے افسانوں کا اختصار انکو خصوصیت بخشتا ہے انکے افسانوں کے واقعات میں کسی طرح کی پیچیدگی نہیں پائی جاتی ۔انکے سیدھے سادے کردار پڑھنے والے کو اپنی ہی دنیا کے معلوم ہوتے ہیں ۔بہت معمولی معمولی باتیں افسانوں میں اس طرح پیش کرتے ہیں جس سے زندگی کا ایک نیا روپ بھی ملتا ہے اور جمالیاتی کیف بھی ——— مثال کے طور پر رتن سنگھ کا افسانہ "جس تن لاگے" تھے ——— جسکا موضوع بظاہر " لوگ جسے یاد رکھیں وہی اسکی زندگی ہے " ہے انداز بیان میں بڑی سچائی سے کام لیا گیا ہے ۔اس کے کردار کے خیالات سے اس نظریہ کا بھی اظہار ہوا ہے کہ خیال وقت اور ماحول کے اسیر نہیں ہوتے ۔افسانہ بیان کرنے والا بظاہر یا رسماً سوہن لال کی ارتھی کے ساتھ شمشان بھومی گیا ہے اس کردار کا سوہن لال سے کوئی ذہنی و جذباتی لگاؤ نہیں وہ ایسے ماحول میں جبکہ ہر طرف لوگ موت پر اظہار خیال کر رہے ہوتے ہیں ۔یہ اپنی اپنی محبوبہ کو یاد کرتا ہے اور شاخ پر دو پرندوں کو دیکھ کر اس بات کی تمنا کرتا ہے کہ کاش کبھی ہم لوگ بھی ایک ساتھ ایک شاخ پر

۱۔پہلی آواز ۔رتن سنگھ ۔ ص ۵۲ ۔ نظامی پریس ۔ لکھنؤ ۔ ۱۹۲۹ء

بیٹھ سکتے -پھر وہ شام کو چاٹ کھانے کا پروگرام بناتا ہے ——————
چتا کے ساتھ گئے ہوئے دوسرے لوگ تیس سال پہلے مرے ہوئے گیان چند کی موت
کا ذکر کرتے ہیں ——————افسانہ بیان کرنے والا کردار اس نتیجہ پر پہنچتا ہے —

" گیان چند مرا نہیں -زندہ ہے اور تب تک زندہ رہیگا
جب تک اسکی موت کی بات سنانے کے لئے لالہ بشمبر ناتھ
یا کوئی اور دوسرا زندہ ہے جب تک گیان چند کی زندگی کی کہانی
دنیا والوں کو یاد ہے تب تک وہ زندہ ہے -جب دنیا والے اسکی
اس کہانی کو بھول جائیں گے گیان چند مر جائے گا -ہمیشہ
کے لئے —— " ۲-

اور اسی لئے وہ سوچتا ہے :-

" سوہن لال کے مرنے سے ایک نقصان ضرور ہوا میرا جاننے
والا ایک آدمی مرگیا -" ۲-

اسے اچانک ایسا لگتا ہے جیسے اسکا اتنا حصہ مرگیا جتنا سوہن لال سے
متعلق تھا ——

رتن سنگھ کے کامیاب افسانے وہ ہیں جن میں انھوں نے نارمل زندگی کی
چھوٹی چھوٹی باتوں کو موضوع بنایا ہے -ان افسانوں کے کردار اس لمحہ کی تلاش میں
سرگرداں نظر آتے ہیں جو انہیں مسرت دے سکے -وہ اسی خوشی کو حاصل کرنے
کے لئے خیالوں کی ایک دنیا آباد کرتے ہیں —— " باپ" ایک ایسا ہی افسانہ ہے
جس میں ایک بوڑھا انسان ہمیشہ اپنے لڑکے کا ذکر اپنے ملنے والوں سے کرتا رہتا ہے —

۱-پہلی آواز -رتن سنگھ -ص ۸۲ -نظامی پریس، لکھنئو - ۱۹۲۹ء
۲- ایضاً ایضاً ص ۸۵ ایضاً ۱۹۲۹ء

اسکی تمام خوبیاں بیان کرتا ہے — ایک نوجوان سے اسکی نوکری کے بارے میں بات کرتا ہے ——— یہاں تک اسکی زندگی کے دن پورے ہوجاتے ہیں اور وہی نوجوان آخری وقت میں محلہ پڑوس کے لوگوں سے اسکے لڑکے کا پتہ مانگتا ہے تاکہ اسے اطلاع دی جائے ———اور تب اسے معلوم ہوتا ہے ————————

" کہ دیال چند کی کوئی اولاد نہیں ہے چونکہ اس بڑھاپے میں اولاد کی کمی شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ اس لئے اپنے دل کو تسلی دینے کے لئے اپنے ملنے والوں پر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ میرا ایک لڑکا ہے —" ۱ا

اس طرح دیال چند محض دل کی تسلی کے لئے مسلسل اولاد کا ایک خیالی پیکر تراشتے ہیں — خیالات کا انسانی زندگی سے کیا رشتہ ہے اسے رتن سنگھ نے بڑی کامیابی کے ساتھ اس افسانے میں بیان کیا ہے — رتن سنگھ کے افسانوں کی سب سے بڑی خوبی جو اپنی انفرادیت بخشتی ہے اور بقول محمد حسن انہیں اردو کا خلیل جبران کہلاتی ہے وہ ہے انکے افسانوں کا اختصار ———بات چاہے انسان کی بھوک کی ہو یا اقتصادی پریشانیوں کی یا نارمل زندگی کی کوئی بھی چھوٹی سی بات ہو بڑے موثر انداز میں مختصراً بیان کردیتے ہیں — انکے افسانوں میں تکنک کے کوئی پیچیدہ تجربہ نہیں ملتے — افسانوں میں تکنک کبھی بیانیہ انداز ہوتا ہے اور کبھی کرداروں کے ذریعہ افسانہ سنایا جاتا ہے ———زبان کی سادگی اور چھوٹے چھوٹے جملوں کی خوبصورت ادائیگی افسانے کی دلکشی میں اضافہ کرتی ہے ———

———————

۱۔پہلی آواز — رتن سنگھ — ص — ۷۷ ، نظامی پریس — لکھنئو — ۱۹۶۹ء

اقبال مجید :-

اقبال مجید کے افسانے کے موضوعات ہماری زندگی میں آنے والے واقعات ہیں ان افسانوں میں فکر و تخئیل کی وہ کشمکش نظر آتی ہے جہاں فرد کسی دو راہے پر کھڑا دو الگ الگ سمتوں کو بیک وقت دیکھتا نظر آتا ہے ۔ان کے افسانوں کے کردار متوسط اور نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں ۔جنکی خواہشات اور ضروریات بھی زندگی کی وہی چھوٹی چھوٹی آرزوئیں اور تمنائیں ہوتی ہیں ۔جن میں گھرے ہوئے اس ملک کے کروڑوں انسان سوچتے سوچتے آخر کار الجھ جاتے ہیں ۔سوچ کی یہ ہی پرواز کبھی دو " بھیگے ہوئے لوگ " میں دو انسانوں کے مختلف حرکتیں کرنے پر آمادہ کرتی ہے اور کبھی " رکرسنگ " میں جوہی اور جمو کو ہزار غلطیوں اور ہزار نفرت کے باوجود ایک ہوجانے پر تیار کردیتی ہے ـــــــــ کبھی ایک انسان محض اپنی چھوٹی سی خواہش کے خاطر (قیمتی گھڑی لگانے کی خواہش) فکری پرواز کی ان حدود تک پہنچ جاتا ہے جہاں وہ گھڑی چرانے کے لئے بغیر کچھ سوچے سمجھے اپنی اس خواہش کو پورا کردیتا ہے ـــــــــ ان افسانوں میں ایک اور خاص بات یہ ہے کہ کردار کے فعل و عمل میں خود کوئی بھی قطعی نتیجہ اخذ نہیں کرتے بلکہ قاری کے لئے ایسے بہت سے امکانات سوچنے کے لئے چھوڑدیتے ہیں جس سے خود پڑھنے والا کوئی نتیجہ نکالتا ہے ۔یہ نتیجہ افسانہ کے کینوس کو وسیع سے وسیع تر کرتا جاتا ہے ۔ ان کے کچھ افسانوں کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ کرداروں کے عمل جاری ہیں اور فنکار بڑی فرصت سے ایک ڈائریکٹر کا کام انجام دے رہا ہے ۔جہاں کہیں بات کردار کے مکالمے یا ایکشن کے ذریعے سے واضح نہیں ہو پاتی ہے وہاں وہ خود کو "میں"

کا کردار بناکر افسانے میں مکالمے ادا کرنے لگتا ہے ــــــــ ان کے ایسے افسانوں کو پڑھ کر لگتا ہے جیسے کوئی واقعہ جو پیش آچکا ہے اب فنکار کے قلم سے بیان کیا جا رہا ہے ۔مثال کے طور پر انکے ایک افسانے " رگ سنگ" میں مرکزی کردار جیو جوہی اور جموہیں ۔جنکی حرکات اور بات چیت سے کہانی کا موضوع اور پلاٹ مکمل ہوجاتا ہے لیکن فنکار خود بھی افسانے میں ایک کردار بنکر ان دونوں کی حرکتوں پر نظریں جمائے رہتا ہے :۔

" رات کو کوئی ایک بجا ہوگا ۔ جاڑوں کی رات تھی
کہرے اور دھند میں لپٹی ہوئی رات میں مجھے
کئی بار کنڈی کی کھڑ کھڑاہٹ کی آواز سنکر جاگنا
پڑا تھا ۔ اگرچہ میرے سرہانے گلی کی طرف کھلنے
والی جو کھڑکی تھی وہ بند رہتی لیکن پھر بھی
میری کھڑکی سے جوہی کے دروازے کا فاصلہ اس
قدر کم تھا کہ اسکے یہاں پکارنے والے کی آواز
صاف سنائی دیتی تھی ، ادھر اس کی کنڈی
ہلتی ادھر میرے کان کھڑے ہوجاتے ــــــــ
ــــــــ لیکن اس بار تو میں اپنے لکھنے کی میز
پر بیٹھا رات گئے تک کام کرتا رہا تھا ــــ ا ا "۱۔

۱۔ رگ سنگ ۔ اقبال مجید (مجموعہ دو بھیگے ہوئے لوگ) ص ۹۹

ٹوٹی ہوئی جھنی میں بھی انھوں نے افسانہ کا آغاز دہی بیانیہ انداز میں کیا ہے اور نئی سال پہلے کا ایک واقعہ اب فنکار کو یاد آیا تو اس نے قلم اٹھالیا اور سوچ سوچ کر گزری ہوئی باتوں کو ٹٹولنا شروع کردیا ـــــــ

کہانی لکھنے کا یہ انداز برا تو نہیں لیکن بہت سے دوسرے :: اچھے افسانہ نگاروں نے بھی اس تیکنیک کو اپنایا ہے لیکن وہاں یہ بیانیہ انداز افسانہ کا ایک لازم جز نظر آتا ہے جس کے بغیر کہانی کو تکمیل تک پہچانا ممکن نہیں ہوتا ـــ لیکن اقبال مجید اگر اپنے ان افسانوں کے پلاٹ اور موضوعات کو صرف کرداروں کے ذریعہ سے ہی اختتام تک پہچاتے تو افسانہ کی خوبی میں کوئی فرق نہ آتا اور قاری کو کردار کے حرکات و سکنات خود اپنی آنکھوں کے سامنے بولتے اور حرکت کرتے ہوئے نظر آتے اور اس بات کا گمان نہ ہونے پاتا کہ کوئی واقعہ بیان کر رہا ہے ـــــــ

اپنے بعض دوسرے افسانوں میں جیسے " دو بھیگے ہوئے لوگ " یا پیٹ کا کچھوا " اور " شو کیس" یا بعض " رگ سنگ " میں نچلے طبقہ کی ایک کہانی اقبال مجید نے انہیں کے ماحول میں پیش کی ہے ـــ افسانے کی زبان اودھ کی عام بول چال کی زبان ہے جسکو عام طور پر قصائی ، تانگہ والے اور دوسرے چھوٹے بڑے طبقہ× پیشہور استعمال کیا کرتے ہیں ۔ اس کا موضوع سماج میں جنسی برائی اور اسکی وجوہات ہیں ـــــــ جسکو دو اہم کردار جوہی اور جمو کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے ـــ مرد اور عورت کے تعلق ناجائز جنسی تعلق کو برا سمجھتے ہوئے بھی اس سے یکسر پرہیز کرنا ان دونوں کے نزدیک ضروری نہ تھا ـ کیونکہ وہ دونوں ایک ایسے سماج اور ماحول کے پروردہ ہوتے

۱؎ افسانہ نگار خود ایک کریکٹر کی حیثیت سے منٹو کی اکثر کہانیوں میں افسانہ کا اہم جز نظر آتا ہے جنکے بغیر افسانہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا ـ

ہیں جہاں یہ برائی بہر حال برداشت کرلی جاتی ہے لیکن شوہر اور بیوی کے رشتہ میں بندھ کر ایک مرد اپنی بیوی کو اس برائی سے ملوّث کرنا ہر گز پسند نہیں کرتا ! ——— نچلے سماج کا ایک شخص جو کسی طرح جوہی کو ایک کاؤں سے ڈاکوؤں کے قبضہ سے نکال لاتا ہے اور اسے اپنی بیوی بناکر زندگی گزارنا شروع کر دیتا ہے ——جوہی ، خوبصورت ، جوان اور جاذب نظر عورت ہے جسکو اپنے شوہر کی پوری محبت اور تمام آسائیش حاصل ہیں —— اسکا شوہر جمّو ، تانگہ ہانکتا ہے دن بھر جو کچھ پیسے کماتا ہے رات کو اپنی بیوی جوہی کے حوالہ کرکے دوسری صبح پھر شہر میں تانگہ چلاتا رہتا ہے دونوں کی زندگی بڑے اطمینان سے گزر رہی ہوتی ہے - اتفاق سے جو کا گھوڑا مرجاتا ہے اور اسکی آمدنی بند ہوجاتی ہے - تھوڑے جمع کی ہوئی پونجی بہت جلد ختم ہوجاتی ہے اور پھر افسانہ اپنا مرکزی خیال جوہی کے کردار کے ذریعہ سے پیش کرتا ہے ! ———عورت سماج ، اور جنس برائی ، ضرورت کی بنیاد پر تینوں ایک مرکز پر جمع ہوجاتے ہیں —دونوں کی ضرورتیں پھر پوری ہونے لگتی ہیں لیکن اب فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ کمائی کا ذریعہ جوہی اپنی جوانی اور جسم کو بناتی ہے —جو دن بھر گھر پڑا افیم کھایا کرتا ہے اور رات کو شوہر کے لاکھ نہ چاہنے پر بھی جوہی کسی مرد کے ساتھ نکل جاتی ہے اور پھر صبح تک جمو اسکی آمد کا انتظار اس ارادے کے ساتھ کیا کرتا ہے کہ اب دوبارہ وہ کبھی نہیں ہونے دیگا —لیکن اسکا بس ایک نہ چلتا ہے مار پیٹ ، دنگا فساد ، گالی اور گلوچ انکی زندگی کا معمول بن جاتا ہے لیکن یہ پیشہ چھوڑنے پر کسی طرح بھی آمادہ نہیں ہوتی ہے —محلہ کے تمام لوگ ، اور دوکاندار جوہی کو اچھی طرح

پہچان لیتے ہیں اور اسطرح افسانہ کا آغاز قصائی کی دکان اپنی دوکان سے شروع ہوتا ہے جس سے اس بات کا صاف پتہ چلتا ہے کہ افسانہ کس ماحول اور کس معاشرہ سے متعلق ہے ——

" جمو ایک جھٹکے کے ساتھ پٹ اور کٹی ہوئی ران سے مکھیوں کا ایک چھتہ اڑکر ادھر ادھر پھیل گیا —— نبے کی چھری جو انگوٹھے میں پھنسی گوشت کی بوٹیاں بنا رہی تھی رک گئی ! —— ننگی ننگی بازؤں کی پھڑکتی ہوئی مچھلیاں جنپر کالے دھاگے میں ایک تعویذ بندھا ہوا تھا رک گئیں : — اس نے نظر گھماکر جمو کی طرف دیکھا اور مسکراکر بولا ! —— آگئیں اشنان کرکے میاں رانی جی !! " ۱

اور پھر افسانہ جوہی اور جمو کی ازدواجی زندگی کے سات سال کا واقعہ بیان کرتا رہتا ہے —— دونوں کی شادی ضرور ہوگئی تھی مگر ایک دن بھی جمو کو شوہر اور بیوی کی اپنائیت سے بھر پور زندگی میسر نہ ہوئی تھی —— اسکی عورت دوسرے مردوں کے ساتھ جنسی رشتہ قائم رکھتی اور یہ لاکھ مارپیٹ اور غصہ کے باوجود بھی اس پر قابو نہ پاسکا ! ——— جمو اپنی بیوی کو بے انتہا چاہتا تھا مگر اسکی چاہت کا اثر بیوی پر کبھی نہ ہوا محضوہ اپنی اس چاہت کے خاطر اپنی بیوی کی بے حیائی ، بدتمیزی کو سرا بنا رہا اور میاں بیوی کا وہ جذبہ محبت جو بیک وقت ایک دوسرے کے لئے دونوں کے دلوں میں پیدا ہونا چاہئے تھا نہ ہوسکا !———

۱۔ اقبال مجید — دو بھیگے ہوئے لوگ — ص ۹۷ افسانہ رگ سنگ

اور آخر ایک دن جوہی کو جمو کی روز مرہ کی روک ٹوک اس سے دور ہوجانے پر آمادہ کرنے لگی ! ! ——— اس نے اپنے گاؤں ماں کے پاس لوٹ جانے کا ارادہ کرلیا۔ جمو نے لاکھ روکنا چاہا مگر اس نے جمو کے منہ پر ایک تھپڑ مارکر گھر سے باہر قدم نکال ہی دیا ! ! ———

اب افسانہ جمو کی ایک دوسری شخصیت کو پیش کرتا ہے ——جمو کے لئے یہ تھپڑ اسکی غیرت کے لئے ایک چیلنج ثابت ہوا ——اس نے اپنی بیوی کی ساری چاہت کو بھول کر اسکا پیچھا کیا اور پھر رات کے وقت گاؤں کے تنہا ویران راستے میں جوہی کو لاٹھی سے اسقدر مارا کہ وہ بے دم ہوکر زمین پر پڑی سسکنے لگی اسکا غصہ اب بھی کم نہ ہوا تھا ——وہ جوہی کو اسی حالت میں چھوڑکر شہر کی طرف واپس چل پڑا —— چند فرلانگ چلنے کے بعد ہی جمو کو پھر اپنی بیوی کا خیال آیا اور اسکے واپس جاکر جوہی کو کاندھے پر اٹھاکر گاؤں سے بالکل قریب محفوظ مقام پر چھوڑ دیا اور پھر اپنے گھر اکیلا واپس چلا آیا ———

" جمو نے تیز تیز قدموں سے چلکر جوہی کو پا لیا
اور منہ سے کچھ کہے بغیر اپنی لاٹھی کو جوہی پر برسانے لگا ۔
دیکھتے ہی دیکھتے اس نے آٹھ دس لاٹھیاں جوہی کے جسم
پر برسا دیں ۔جوہی چیخی چلائی اور پھر زمین پر ڈھیر
ہوکر سسکنے لگی ! ———————————
——— اب مجھے مار تھپڑ ! ؟ ————— یہ کہکر جمو نے
زمین پر تھوکا اور الٹے پاؤں چل دیا ! جوہی کو سسکتا چھوڑ
کر ! ————جمو ایک لمحہ گردن جھکائے سوچتا رہا اور

پھر نہ جانے کیا سوچکر پلٹ پڑا ــــ وہ جوہی کے قریب
پہنچکر رک گیا ۔کچھ دیر کھڑا اسے یوں ہی دیکھتا
رہا پھر جھک کر جوہی کو اپنے کندے پر لادا اور چپ چاپ
گاؤں کی طرف چل دیا ۔جب وہ گاؤں سے چند گز کے فاصلہ
پر رہ گیا تو اسنے جوہی کو ایک کھیت کی منڈیر پر ڈالدیا ۔
اور اپنی لاٹھی کندھے پر رکھ کر اسٹیشن کی طرف جس
راستہ سے آیا تھا تیز قدموں کے ساتھ لوٹ گیا ۱۱ ــــ "۱

آہستہ آہستہ تین مہینے گزر گئے ۔ جمو اکیلا دن بھر شہر میں پھیری لگاکر دوچار پیسہ کمالیتا مگر جوہی کا خیال اب بھی اسکے دل سے دور نہ ہوسکا تھا ۱ ــــ وہ اکثر اسکو یاد کیا کرتا اور خواب میں اس کے آنے کی آہٹ سنا کرتا ۱ ــــــــ ایک دن خلاف امید جوہی پھر واپس لوٹ آئی اور جمو کے گھر میں داخل ہوکر چپ چاپ بیٹھ گئی ۱ ــــــــ جمو کو اپنا خواب حقیقت کے روپ میں نظر آنے لگا ــــ اسکا جی چاہا کہ اسکی ساری غلطیاں معاف کرکے پھر سے اسکو اپنے گلے سے لگالے کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ جوہی کو شوہر کی اہمیت ہی کا علم نہ تھا ۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ ازدواجی زندگی کیا ہوتی ہے ؟ ۔اسکو تو یہ بھی پتہ نہ تھا کہ مرد کا احترام اور صرف ایک مرد کو اپنا سبکچھ جان کر اس کا ہوجانا چاہئے کیوں کہ جوہی ایک بھیکارن کی بیٹی کا کوئی باپ نہ تھا اس نے مردوں کو کبھی شوہر کے روپ میں نہ دیکھا تھا ۱ ــــ اور یہی وجہ تھی کہ وہ بھی کسی ایک مرد کے ساتھ زندگی گزارنے کے تصور سے نا آشنا تھی ۱ ــــــــ جمو نے اسکو پھر اپنے سے قریب کرنا چاہا جوہی کو اپنے پیارے ۔ نرم اور محبت سے لبریز لہجہ میں اس بات کا احساس

۱۔دو بھیگے ہوئے لوگ ۔اقبال مجید ۔ افسانہ رگ سنگ ۔ص ۱۱۲ ۔ ۱۱۵

دلانا چاہا کہ زندگی کی اصل خوشی صرف ایک مرد اور عورت کے پاک رشتہ میں ہے - ان دونوں کے جذبوں ، احساس اور ضرورتوں کو سمجھنے میں ہے ایک گھر ، ایک سنسار اور کوٹھری کی چھت کے نیچے زندگی بسر کرنے میں ہے - اور تب ، جوہی نے شائد زندگی میں پہلی بار عورت اور مرد کے پاک رشتہ کو سمجھا تھا ، دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا تھا اور شادی کی اہمیت کو مانا تھا ! ————

جوہی ، جمو کی گود میں سر رکھے سب کچھ سن رہی تھی ———— دل ہی دل میں اپنی بے حیا ، ذلیل ، اور بے مقصد زندگی پر شرمندہ ہو رہی تھی اور شائد پہلی بار اسے اپنے شوہر کی قربت کا احساس ، اطمینان ، آرام اور سکون پہنچا رہا تھا -

" دونوں چپ تھے ، جمو دھیرے دھیرے ، اب بھی جوہی کا سر دبا رہا تھا - جوہی نے یکا یک اپنے ہاتھ آہستہ سے بڑھائے اور جمو کے دونوں ہاتھوں کو بڑی نرمی کے ساتھ کلائی سے پکڑ لیا رات کا چھایا ہوا سکوت جیسے کھنا کر رہ گیا جوہی نے آہستہ آہستہ اس کے ہاتھوں کو اپنے سینے کی طرف کھینچا اور پھر جیسے رات کی خاموشی کے لبوں پر ایک ارتعاش سا پیدا ہوگیا ! ———— " تجھ سے ملنے کو من کرتا تھا اس لئے سے طلاق کا بہانہ کرکے چلی آئی تھی " ————
اور پھر جوہی نے جمو کو اپنے سینے سے چمٹا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی — پتھر کی رگ پھٹ گئی تھی - اور اس سے پانی کا فوارہ چھوٹ رہا تھا !! ———— " ا-

---

ا- دو بھیگے ہوئے لوگ - اقبال مجید - افسانہ رگ سنگ - ص ۱۲۴ - ۱۲۲ - ۱۲۵

افسانہ بڑی خوبصورتی کے ساتھ قاری کے ذہن پر نہایت ہی لطیف احساس کے ساتھ ختم ہوجاتا ہے ——اور قاری کو ایسی بہت سی باتیں سوچنے پر مجبور کردیتا ہے جسکی بنا پر دونوں کی زندگی کو استوار ہونے میں اسقدر دیر لگی ۔—— اس افسانہ میں ایک عورت یعنی جوہی جو شادی اور خانہ آبادی کے تصور سے یکسر بے بہرہ تھی خلاف امید ازدواجی زندگی میں داخل ہوکر بھی وہ اپنی ماں اور اپنے گاؤں کے ارد گرد کی دوسری عورتوں کی زندگی پر خود کو بھی چلانا چاہتی تھی ۔ کیوں کہ اس کے نزدیک زندگی گزارنے کا کوئی دوسرا تصور تھا ہی نہیں ۔—— لیکن جمو اپنی بیوی کو محض اپنی عورت کی شکل میں دیکھنا چاہتا تھا جو ہمارے سماج کے مردوں کی عین خواہش ہوتی ہے ۔مگر وہ اپنی بیوی پر پابندی لگاکر یا سختی کے ذریعہ ایسا نہ کرسکا ۔ ——اور یہ دونوں باتیں ان کے ماحول کا لازمی نتیجہ تھیں ——اقبال مجید نے افسانہ میں کیفیت اور تاثر کے ذریعہ خاص ایک ماحول اور فضا میں جوہی کی شخصیت میں لطیف احساس کے ساتھ خاموش تبدیلی پیدا کرکے کہانی میں ایک ایسی داخلی حس کو نمودار کیا ہے جس سے افسانہ پڑھنے والا فکر کی نئی فضا میں پرواز شروع کردیتا ہے اور یہی اس افسانہ کی خوبی ہے ۔۔ ——

اقبال مجید کا ایک دوسرا افسانہ " دو بھیگے ہوئے لوگ" ۵۰ء(ص) کے بعد ایک نئے موضوع کو پیش کرتا ہے ——بہت معمولی سی سیدھی سادی بات کو انہوں نے بڑی باریکی سے دیکھا ہے ایک کردار کی نہ ظاہر ہونے والی مجبوری نے افراد کی تہذیبی قدروں میں جذبہ کی دو مختلف سمتوں کو معین کیا ہے ۔——

دو بھیگے ہوئے لوگ ۔ اچانک اور خلاف امید بارش کے آجانے سے فوری طور پر ایک

بوسیدہ سائے بان کے نیچے کھڑے ہوجاتے ہیں ! ۔۔۔۔۔ لیکن تیز بارش کی وجہ سے چھت پر سے ٹپکتا ہوا پانی ان دونوں کو بھگونے لگتا ہے ——— ایک کردار بارش میں پوری طرح بھیگ کر کسی ایسی جگہ پہنچ جانا چاہتا ہے جہاں وہ آرام اطمینان کے ساتھ اپنے کپڑے خشک کرسکے ! ——— اور دوسرا ، اس نام نہاد سائبان کے نیچے ہی بارش سے بچنے کی حتی الامکان کوشش کرتا ہے ———

ایک کردار کھلے آسمان میں موسلا دھار بارش سے بھیگ کر نجات کا راستہ اختیار کرتا ہے اور وہ اپنے دوسرے ساتھی کو سائبان کے نیچے چھوڑ کر اکیلا چل دیتا ہے دونوں کی سوچ کے فرق پر غور کرتا ہوا کافی ہاؤس کی طرف بڑھ جاتا ہے ——

" یہ سوچ کا فرق ہے ۔ بات یہ ہے کہ ہم زندگی کو کیسے دیکھتے ہیں ؟ ! ——— مرنا تو سب کو ہے ۔ اتنا اہم نہیں اہم یہ ہے کہ ہم کس طرح مرتے ہیں ؟ ! ———

تب میں ان لوگوں سے پوچھوں گا جو میرے ساتھی ہیں وہ کس کے لئے مرنا پسند کریں گے ؟ ——— کس طرح یہ انکا ذاتی معاملہ ہے ، ——— لیکن کس مقصد کے لئے موت انہیں قبول ہوگی ؟ ——— کیا ایک ٹپکتی ہوئی چھت کے نیچے ڈبل نمونیا کا شکار ہوکر مرنا ایک عظیم مقصد ہے ؟ ——— میں جانتا ہوں وہ لوگ میری بات سنیں گے ۔ مجھ سے کہیں گے کہ تم میں ۱۹۶۰ء کے بعد چیتنا بول رہی ہے ۔ تب میں ان سے کہوں گا کہ ہاں تم لوگ ٹھیک کہتے ہو ! ——— یہی بڑا فرق ہے ——— سوچ کا فرق ، اور پھر میں انہیں بتاؤں گا کہ اب بھی ایک آدمی اس چھت کے نیچے

کھڑا ہے جو کھلے آسمان کے نیچے بھیگنا پسند نہیں کرتا ،
لیکن بھیگ رہا ہے ا "۔۔۔۔۔۔۔

یہ ہی کردار سوچ کی مختلف منزلوں کو طے کرتا ہوا لگاؤ ، حیرت و جستجو اور عقیدہ کی الجھن میں مبتلا بارش میں بھیگتا ہوا چلا جارہا تھا ا ۔۔۔۔۔اس کردار کی سوچ اور غور و فکر کے مختلف انداز افسانہ میں تجریدی رنگ پیدا کردیتے ہیں ایک ایسا تجریدی رنگ جو افسانہ کو الجھاتا نہیں ہے بلکہ خیال آجے کی تہذیبی قدروں کی مذ بھیز کو واضح کرتا جاتا ہے ۔۔۔۔۔۔۔

بارش رک جاتی ہے اور وہ کردار ایک ہوٹل کے پاس رک کر اپنے کپڑے سکھارہا ہوتا ہے کہ پھر وہی شخص جو سائبان کے نیچے ٹھہرا رہا تھا اب اسکے قریب سے گزرتا ہے اور ہوٹل میں ٹھہر کر دونوں چائے کے ساتھ ساتھ اپنے اپنے عمل کی تائید میں گفتگو شروع کرتے ہیں ا ۔۔۔۔۔افسانہ کے آخر کے جملے یہ واضح کردیتے ہیں کہ اس شخص کے جیب میں ایسی ہی کوئی چیز تھی جسکو وہ ہر قیمت پر بھیگنے سے بچانا چاہتا تھا اور جس کے خاطر وہ سائبان کے نیچے کھڑا اسکو بچاتا ہے ۔۔۔۔۔جب کہ دوسرے شخص کے پاس سوائے ٹیرالین کی شرٹ پینٹ اور کچھ ریزگاری کے سوا کوئی بھی ایسی چیز نہ تھی جسکے بھیگ جانے پر ضائع ہوجانے یا خراب ہونے کے ڈر ہو ا ۔۔۔۔۔ اس خیال کی تائید کہانی کے ان جملوں سے ہوتی ہے :۔

" آپ کے پاس جوتے ، قمیض ، پتلون اور ریزگاری کے علاوہ کوئی

ا۔ دو بھیگے ہوئے لوگ ۔اقبال مجید ۔افسانہ دو بھیگے ہوئے لوگ ا ص ۲۹۱

چیز نہیں لیکن میرے پاس ہے — آپ کے لئے اگر جوتے اور
قمیض ، پتلون اور ریزگاری بھیگ بھی جائے تو بھی کوئی
فرق نہیں پڑتا — لیکن میں جوتے قمیض اور پتلون کے بھیگ
جانے پر بھی اس چیز کو بھیگنے سے بچانا چاہتا ہوں ۔"[1]

ایسی کون سی چیز تھی جسکو وہ بھیگنے سے بچانا چاہتا تھا یہ سوال آخیر تک افسانہ نگار نے صاف لفظوں میں ظاہر نہیں کیا جو یقیناً افسانہ کو کئی ایک فکری جہتیں بخشتا ہے اس سے بھی زیادہ قابل غور بات یہ ہے کہ بیک وقت قاری کو بیک وقت دونوں کرداروں کے جذبے سے اتفاق کرنا پڑتا ہے —

ایک دوسرے افسانے میں انھوں نے ہمارے سماج کے ایک فرد کی ذاتی خواہش اور اسکی مایوسیوں کو مرکزی حیثیت دیکر " شوکیس کے عنوان سے ایک افسانہ لکھا ہے — فن ، موضوع ، یا تکنیک کے اعتبار سے تو کسی خاص توجہ کا مستحق نہیں ہے لیکن یہ افسانہ نئی نسل کی بڑھتی ہوئی ضروریات اور محض شوق کی تکمیل کے خاطر پڑھے لکھے نوجوانوں کی داخلی کیفیت کا اظہار ہے ——— داخلی کیفیت کا یہ رجحان ماحول سے بنتا ہے — ایک ایسی سوسائٹی سے جس میں ایسے لوگ ہیں جنکے ہاتھوں پر خوبصورت ، قیمتی گھڑیاں بندھی ہوئی ہیں جنکے سبب سے ان لوگوں کی شخصیت نسبتاً زیادہ رعب دار اور قابل توجہ نظر آتی ہے ——— اور یہی احساس ایک نوجوان کو جو اس وقت صرف بی — اے کا طالب علم ہوتا ہے اپنے لئے بھی کوئی اچھی ، شاندار ، قیمتی اور قابل توجہ گھڑی حاصل کرنے پر آمادہ کرنے لگتا ہے ——— جب کہ وہ جانتا ہے کہ اسکے باپ کی آمدنی سے وہ ہرگز اتنی قیمتی گھڑی نہیں خرید سکتا ———

۱۔ دو بھیگے ہوئے لوگ — اقبال مجید — ص ۲۹۷

وہ ایک آزاد ملک کا سمجھ دار نوجوان ہے جس میں ترقی کرنے کی جستجو ، حاصل کرنے کا جذبہ اور اچھے اسٹیٹس پر خود کو فائز کرنے کا حوصلہ ہے اور وہ اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لئے کسی خوش آئند مستقبل کا انتظار کئے بغیر فوری طور پر کچھ کرنا چاہتا ہے اور یہی فوری طور پر کچھ کر گزرنے کا عمل اس سے چوری کا عمل سرزد کرواتا ہے - چونکہ وہ پیشہ ور چور نہیں ہے اور نہ ہی وہ عمل بد کو پیشہ کے لئے اپنے سے منصف کرنا چاہتا ہے اس لئے وہ اپنی دس داخلی خواہش کو پورا کرنے کے لئے کوئی قیمتی گھڑی حاصل کرنا چاہتا ہے ـــــ گھڑی کی ایک دوکان میں " شوکیس" میں رکھی ہوئی ایک گھڑی اسکو پسند آجاتی ہے جو بظاہر رنگ اور بناوٹ کے لحاظ سے اسکے ہاتھ پر لگی ہوئی ۵۰ روپے کی گھڑی سے بہت ملتی جلتی ہے ـــ وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ کس طرح وہ اپنی سستی گھڑی کو اس جگہ رکھ کر شوکیس میں رکھی ہوئی -/ ۲۵۰ روپے والی گھڑی کو اٹھالے ـــــ وہ ایک دو بار دوکان میں داخل ہوکر بہت ساری گھڑیاں دوکاندار سے دیکھتا ہے لیکن اسکی نظر تو شوکیس میں رکھی ہوئی -/ ۲۵۰ والی گھڑی پر ہی قائم رہتی ہے ـــ ایک دن وہ ہمت کرتا ہے اور دوکاندار کی نظر بچاکر شوکیس سے وہ گھڑی اٹھاکر ٹھیک اس جگہ پر اپنی گھڑی رکھدیتا ہے اور دھڑکتے دل کے ساتھ دوکان سے باہر نکل آتا ہے ـــــ وہ اپنی اس کامیابی پر خوشی سے پھولے نہیں سماتا ہے لیکن اسوقت اسکو اپنی آرزو کی شکست کا احساس بری طرح ہوتا ہے جب وہ ایک دو روز گھڑی ساز کو وہ گھڑی دکھاکر یہ کہتا ہے کہ شائد کوئی معمولی سی خرابی کی وجہ سے گھڑی چل نہیں رہی ہے اس لئے وہ اسے کھول کر ذرا ٹھیک کردے ـــــ کھلنے پر پتہ چلتا ہے کہ صرف ڈائل کے اوپر سوئیاں لگی ہوئی

تھیں اور مشین غائب تھی ! ——— ہماری آج کی نئی نسل ایسی ہی نہ جانے کتنی چھوٹی چھوٹی آرزوؤں کی تکمیل کے خواب دیکھا کرتی ہے اور ان کے حصول کے بعد اکثر شکست کا احساس دوگنا ہوجاتا ہے ۔۔افسانہ کے کردار نے جسکی زبانی پورا واقعہ بیان کیا ہے بغیر مشین کی گھڑی کا صرف ڈائل اور سوئی لئے ہوئے یہ سوچ رہا ہوتا ہے :-

" ایک وقت میں میں نے دو بازیاں ہاری تھیں ایک بازی میں
اپنی پچاس روپیہ کی گھڑی ، اور دوسری بازی میں اس آرزو کی
شکست ہوئی تھی جسکو میں ایک مدت سے پال پوس رہا تھا !!"[1]

مگر اس نوجوان کو اپنی اس آرزو کی شکست کا احساس مجبور بناکر خاموش نہیں کر دیتا ہے بلکہ وہ کم از کم اپنی ذاتی گھڑی کو پھر دوکان سے لوگوں کی نظر بچاکر واپس لے آنا چاہتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح وہ پہلے یہ حرکت کرچکا تھا ———
وہ پھر دوکان میں جاتا ہے اور موقع پاتے ہی وہ گھڑی رکھ کر اپنی گھڑی کو اٹھا لیتا ہے اس لمحہ اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اپنی ہی گھڑی کو دوبارہ حاصل کرکے اس نے سب کچھ پالیا ہو ! ——وہ امید ادھر ادھر دیکھتا ہے اور اس یقین کے ساتھ دوکان سے باہر نکلنے لگتا ہے کہ اس بار بھی اسے کسی نے یہ حرکت کرتے ہوئے نہیں دیکھا ! ———
لیکن فوراً ہی دوکاندار نے مسکراتے ہوئے بڑی لاپرواہی سے کہا :-

" جن دوکانوں میں بہت آئینے ہوں وہاں بڑی مشکل پڑجاتی ہے "،
———جی جی ! میں جیسے کانپ اٹھا ،کیا بات ہے ؟
میرے حلق سے جیسے میری ہی آواز نکلی ، ——وہ میری آنکھوں

۱۔دو بھیگے ہوئے لوگ ۔اقبال مجید ۔ " شوکیس" ص۱۹

میں دیکھتے ہوئے بڑی تلخ مسکراہٹ مسکرایا اور انتہائی
سرگوشی کے انداز میں بولا ! ——باہر جانے سے پہلے
ایک بار گھڑی کا کیس کھولکر دیکھ لینا ورنہ پھر دھوکہ
ہوجائیگا !! ۔" ۱۔

افسانہ انہیں جملوں کے ساتھ ختم ہوجتا ہے ۔یہاں فرد کی شخصیت کی ایک چھوٹی سی آرزو کی تکمیل کے ناکامی اور شرمندگی کا احساس ایک بالغ ذہن اور سمجھدار انسان کے لئے ایک سبق ہے ——اس سے ایک طرف تو ہمارے موجودہ نوجوان کے ذہنی تخئیل کا اندازہ ہوتا ہے اور دوسری طرف وہ ایک ایسی الجھن کا شکار نظر آتا ہے جو اسکی اپنی پیدا کی ہوئی ہوتی ہیں اور یہ تمام باتیں محض آج کی بڑھتی ہوئی انسانی ضرورتیں ہیں جنکے بغیر بھی بلا کسی زحمت کے رہا جاسکتا ہے —— اسی طرح کی چھوٹی چھوٹی باتیں جنکا تعلق براہ راست ہماری زندگی سے وابستہ ہے اور انہیں باتوں کو برتنے کا سلسلہ اگر ہمارے اندر نہیں ہے تو دشواریاں سامنے آجاتی ہیں ——اقبال مجید نے ایک اور کہانی " پیٹ کا کچوا " لکھ کر ایک ایسے منتشر ذہن کی کیفیت پیش کی ہے جو مذہبی رسم و رواج سے یکسر منکر بھی نہیں اور پورے طور پر انکی پابندی کرنا بھی دشوار طلب ہے ——وہ مذہب ، عقیدہ ، اور رسم و رواج سے خود کو آزاد رکھنا چاہتا ہے ۔ایسے ہی کردار کے گھر یعنی اسکے سات سالہ بچہ کی اچانک موتکے بعد اسکی تجہیز و تکفین کا مسئلہ درپیش ہوتا ۔

۱۔ دوبھیگے ہوئے لوگ ۔اقبال مجید ۔ص ۱۹۲

یہ کردار وطن سے دور مانک پور جیسی جگہ پر جہاں اسکا اپنا کوئی رشتہ نہ تھا اپنے بچپکی موت کے بعد تلملا اٹھتا ہے اسکی سوچھ میں مذہب ، رسم و رواج ، شیعہ سنی اور ان کے عقیدے سب کچھ ایک ایسی تکلیف دہ فکر مبتلا کر دیتے ہیں کہ وہ کچھ کرنےسے قاصر رہتا ہے ـــــ " پیٹ کا کچوا " افسانہ میں ایک اہم کردار کی حیثیت سے ہر اس لمحہ مردہ بچہ کے باپ کی ذہن میں کچوکے مارنا شروع کر دیتا ہے جب کبھی وہ مذہبی عقیدوں کے مسئلوں پر غور کرتا ہے ـــ یہ پیٹ کا کچوا کیا کوئی لازوال حقیقت ہے جو ہر انسان کے اندر چھپی رہتی ہے یا ایسی ہی کوئی نقصان دہ شے ہے جو انسان کے اندر گھسی ہوئی اسے آہستہ آہستہ کمزور بناتی جاتی ہے ـــــ یہاں بھی اقبال مجید نے سماج کی بعض ایسی تہذیبی مذہبی قدروں کی طرف اشارہ کیا ہے جو اب ہماری شخصیت کا ایک جز بن گئی ہیں اور جن سے اختلاف کرنا پرانی قدروں اور مذہبی عقیدوں کے خلاف جنگ کرنا ہے ۔مگر نئی نسل کا انسان پرانی تہذیب کی روائتی قدروں کو دل سے ماننے کو آمادہ نہیں کیوں کہ وہ اب یہ محسوس کرنے لگا ہے کہ اس سے صحت مند جذبہ ، اور فکر کی وسعت داغدار ہوتی ہے ـــ لیکن پھر سوال آ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سی ایسی متوازن راضجات ہے جن پر چلکر سماجی اور مذہبی حقیقتوں کی گتھیوں کی عقدہ کشائی سو رکتی ہے ا ـــــ کیا مذہبی رسم یا شیعہ سنی ، اور کسی بھی مذہبی عقیدہ کی پروا نہ کرتے ہوئے کوئی بھی ہمارے سماج کا فرد اپنے معصوم بچہ کو میونسپلٹی کے کھورے پر چپ چاپ پھینک سکتا ہے ؟ ؟ ! کیا وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی ہی اولاد کو سڑتے گلتے دیکھ سکتا ہے ؟ اگر ایسا نہیں ہے تو انسانی زندگی ذہن کے اندر رینگنے والا وہی پیٹ کا کچوا کسی بھی فرد کو سوچنے پر مجبور کر دیگا اور آخر کار سوچتے سوچتے اس کے جسم کا اچھا خاصہ

حصہ پیٹ کے کچوے کی خوراک بنکر اسے کمزور بناتا جائیگا اور یہی ہماری تہذیب جو انسانی فرد کی شخصیت کا ایک اہم حصہ بن چکی ہے اگر ہم اسپر پوری طرح عمل پیرا نہیں ہوتے ہیں اور عقیدوں سے اپنے آپ کو بلند تر رکھ کر سماج کی نئی تشکیل کرنا چاہتے ہیں تو ضرور ذہن کے × و جسم کے کسی نہ کسی کونے میں اس خیالی کچوے کا وجود ہوجائیگا ۱۔اور جیسے جیسے انسان سماجی بندشیں اور تہذیبی قدروں کا پابند ہوتا جائیگا اسی قدر یہ کچوا بھی آہستگی انسانی جسم کا ایک حصہ بنکر اسکے ذہن و دل اور جسمانی غذا کا حصہ دار ہوتا جاتا ہے :-

" اور آخری بار تصدیق کی کہ اسکا وجود ایک کیچوے کے مانند ہے جو میرے پیٹ میں پیدا ہوتا ہے اس روز سے جس روز سے میں نے دنیا میں آنکھ کھولی ہے اور اپنی ماں کا دودھ پیا اسی روز سے میری تمام تر غذاؤں کا ساجھے دار رہا ہے —"۔۱

اور اسطرح اس انسان نے شکست مانکر اپنے بچہ کو سماج کے لوگوں کے حوالہ کرکے چپ چاپ نظریں جھکالیں — اسکی تجہیز و تکفین سنی عقائد کے مطابق ہوگئی لیکن اس نے اپنے ذہن میں رینگنے والے اس کیڑے یا کیچوے کی موجودگی کو ایک شکست خور وہ انسان سمجھکر ہار تسلیم کرلی ——اور پھر آخر ان جملوں سے اسکی شکست کا اظہار ہوجاتا ہے :-

" میری آنکھوں میں آنسو آگئے ، یہ آنسو میری شکست کا اظہار تھے لیکن تب بھی میں نے اس سے یہ نہیں کہا کہ

۱۔دو بھیگے ہوئے لوگ ۔اقبال مجید ۔ص ۲۶۲

راجہ کی لاش اگر جلائی جاتی تو مجھے بے حد افسوس
ہوتا وہ مجھے روہانسا دیکھکر بولا ! ——شائد تمہاری
صحت ٹھیک نہیں ؟ !! ——" ۱۔

اقبال مجید نے ابھی تک اپنے ہم عصر اچھے افسانہ نگاروں کے مقابلہ میں بہت کم لکھا ہے لیکن جو کچھ انہوں نے لکھا ہے ان میں بعض افسانے ، اس فن میں بالکل نئے موضوع ، اچھوتے طرز فکر ، اور سماج کے درمیانی خط کو نقطۂ نمایاں طور پر واضح کرنے کی کامیاب کوشش ہے ——ان کے یہاں زبان کا روائتی اورسید ھا سادہ انداز ہے جس کو سمجھنے کے لئے قاری کو کسی کوشش اور لسانی نکتہ سمجھنے کی پیچیدگی درکار نہیں ہوتی ——ہاں البتہ انہوں نے اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لئے فکری علامت کا استعمال ضرور کیا ہے جس سے پورا افسانہ تجریدی گرفت میں قید ہوکر ایک فکری آہنگ کی شکل اختیار کرلیتا ہے ——

—— xxx ——

۱۔ دو بھیگے ہوئے لوگ ۔اقبال مجید ۔ " پیٹ کا کچوا " ص ۲۲۲

اقبال متین :-

اقبال متین زندگی کی چھوٹی چھوٹی مگر بڑی اہم حقیقتوں کو اپنے افسانوں میں پیش کرتے ہیں ان کے افسانوں کی زبان سادہ ہوتی ہے ۔کردار کا انتخاب واقعات اور افسانے کی نوعیت کو دیکھ کر کرتے ہیں ۔ان کے افسانوں میں عام طور پر کہانی کردار کے ذریعہ بڑھتی ہے ۔۔۔اقبال متین کبھی بڑھتے ہوئے ملک کی آبادی اور اقتصادی حالات کی تنگی میں کم پڑھے ہوئے کم پیسے والے اور زندگی کا کوئی واضح تصور نہ رکھنے والے خاندان کی عکاسی کرتے ہیں اور کبھی بدلتے ہوئے سماج میں پھوٹتی ہوئی برائیوں کے مثبت پہلو پر غور کرتے ہیں ان کی کہانیوں میں اکثر ایسے بھی موضوعات ملتے ہیں جو محض جنسی تکمیل کے خاطر غیر فطری عمل کا اظہار ہوتے ہیں ۔۔۔۔۔۔۔انھوں نے ایسے کرداروں کو بھی اپنی کہانی کا مرکز بنایا ہے جو سفید پوشی کا کو قائم رکھنے کی خاطر ، عیاری ، مکاری اور جھوٹ بولکر سماج میں باعزت رہنا چاہتے ہیں اور انکی کہانیاں آہستہ روی سے چلتی ہیں اور ایک جھٹکے کے ساتھ کچھ اس طرح ختم ہوجاتی ہیں کہ قاری انجام کے بعد بھی ذہن میں بہت دور تک پڑھتا اور سوچتا چلاجاتا ہے ا

وہ اپنی ایک کہانی "پو پھوٹنے تک" میں ایک ایسے گھر کی عکاسی کرتے ہیں جسمیں ایک نچلا خاندان اپنے کئی بھائیوں اور ماں باپ کے ساتھ چھوٹی سی کٹیا میں زندگی بسر کررہا ہوتا ہے ۔۔۔۔۔اقتصادی حالات اچھے نہ ہونے کی بنا پر بڑے مکان کا تصور ان کے نزدیک ممکن نہیں ۔۔۔۔۔ماں باپ اپنی بہت سی اولادوں

کو پیدا کرکے پھر اسکی بھی شادیاں کرکے زندگی کے بقیہ دن گزار رہے ہیں ——— لڑکے کسی نہ کسی طرح اپنی بیویوں کے ساتھ رات کے اندھیروں میں جنسی تسکین حاصل کیا کرتے ہیں ——— ایک لڑکی جو اب جوان ہو رہی ہے اکثر رات کو ایک ہی کٹیا میں اپنے بھائیوں کو بھابی کے ساتھ لیٹا ہوا دیکھا کرتی ہے ——— ایک رات بارش کی زیادتی کی وجہ سے سب اندھیرے میں پڑے رہتے ہیں اور انھیں اس بات کا بھی ہوش نہیں رہتا ہے کہ جن عورتوں کے ساتھ وہ ہم آغوش ہوتے ہیں وہ انکی بیویاں ہیں بھی یا نہیں ! ؟ ! ——— رات کا یہ منظر گھر کی کنواری پوجی دیکھ لیتی ہے اور اسے یہ پتہ چلتا ہے کہ رات اسکی بھابیاں جن کے ساتھ لیٹی تھی وہ انکے اپنے شوہر نہ تھے ؟ ———

ایک اقتباس میں اقبال متین نے ایسے گھر کی عکاسی کچھ اس طرح کی ہے —

" ایک رات طوفانی بارش تھی ، سیلی ہوئی زمین بھیگی ہوئی کچی دیواروں اور چھپر کے درمیان تیز تیز سانسوں کی گرمی اور حدت بھی جیسے ٹھٹھر رہی تھی — بوسیدہ کمبلوں اور چتھڑوں میں لپٹے ہوئے انسانی جسم ایک دوسرے میں اپنی حرارت منتقل کرکے سرد ، ٹھنڈی ، اور یخ بستہ رات کو جھٹلانے کی ناکام کوشش میں اپنے گرم گرم جسم اور سانسوں کی حدت کے سہارے سیلی ہوئی زمین پر سکڑ رہے تھے ——— اور رات آہستہ آہستہ بڑی گمبھیر ہوتی جارہی تھی ۔"۱۔

مختصر سے اس افسانے میں کثرت اولاد اور اس سے پیدا ہونے والی دشواریوں ، پریشانیوں

۱۔ پو پھوٹنے تک — اقبال متین (مجموعہ خالی پٹاریوں کا مداری) ص ۱۵۰ ۔ ۱۹۷۷ء

اور شرمندگیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے —— جو ہمارے آج کے دور کا ایک اہم مسئلہ ہے —— اور یہی مسئلہ افسانہ کا موضوع ہے —— غریبی پہلے بھی تھی کثیا کا وجود پہلے بھی تھا اور کثرت اولاد کے سبب بھوک اور افلاس کی مشکلات سے لوگ پہلے بھی دوچار تھے ، لیکن پھر بھی پرانے افسانہ نگاروں نے ایسے کسی ماحول کو پیش نہیں کیا جہاں جوان بیٹے اپنی بیویوں کے ساتھ اسی ایک کوٹھری میں ماں باپ ، دوسرے بھائیوں اور کنواری بیٹیوں کی موجودگی میں جنسی خواہش کی تکمیل میں جھجھک محسوس نہ کرتے ہوں ! —— مگر آج ادیب کے سامنے ایسے گھر موجود ہیں ، جہاں ایسا ہوتا ہے ————————

اقبال متین کے افسانوں کے موضوعات زمین سے قربت کا احساس دلاتے ہیں ہمارے دور میں وہ نئی ابھرتی ہوئی آوازیں جو پہلے بے آواز نظر آتی تھیں اب انکی چیخ صاف سنائی دیتی ہے —— اس دور کا شہر آشوب انکی کہانیوں میں دیکھا جاسکتا ہے ————

ایک دوسرے افسانے میں یہی فنکار شادی کے بعد آنیوالی نا آسودہ زندگی کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ہمارے سماج میں بعض کے ساتھ درپیش ہے ———— کہانی صرف دو مرکزی کرداروں کے ذریعہ اچانک ایک بادو باراں والی رات میں ٹرین کے ایک سفر سے شروع ہوتی ہے —— کہانی کا نام ہے " ہمسفر " ایک خوبصورت عورت فرسٹ کلاس کے ڈبہ میں اکیلی سفر کر رہی ہوتی ہے —گاڑی اسٹیشن پر رکتی ہے اور پھر جیسے حرکت کرتی ہے تو دروازہ کھلتا ہے اور ایک نوجوان گھبراہٹ میں داخل ہوجاتا ہے —— عورت اپنی فطرت کے مطابق پہلے تو اس مرد کو دیکھ کر گھبرا جاتی ہے ۔اسے اپنی عزت کے لٹنے کا بھی ڈر رہتا ہے اور سامان کے چوری ہوجانے کا خطرہ

بھی ـــــ وہ بجائے اسکے چیخے چلائے ، بڑی نرم روی سے مرد سے مخاطب ہوکر برجستہ باتیں کرتی ہے اور ذریعہ ایک " سوٹ کیس" بنتا ہے جو نہ جانے کیسے مرد ڈبہ میں رکھنا بھول جاتا ہے ـــــ باتیں ہوتی رہتی ہیں یہاں تک کہ دونوں ایک دوسرے سے مانوس ہوجاتے ہیں ـــــ اور تھوڑی دیر کے لئے دونوں ایک دوسرے میں اپنی ابدی خوشیاں دیکھنے لگتے ہیں ـــــ لیکن عورت کا ایک انکشاف اسکی ازدواجی زندگی کی ناآسودگی کے ساتھ تقریباً کہانی کو ختم کردیتا ہے ۔

" اسنے نظریں جھکالیں ، پھر جدا ہونے تک آنکھیں چار نہیں کیں ـــــ میں ان جھکی جھکی نظروں کو دیکھ بھی نہ سکا ۔ ـــــ بہت سنبھل کر بڑے اندرونی کرب سے اسنے کہا ! ـــــ
" ہمارے سماج میں کتنے ہمسفر بڑی بے دلی سے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے زندگی کا سفر طے کررہے ہوں گے ـــــ
میں بیھاتا ہوں ـــــ میری شادی چھٹپن ہی میں ہوگئی تھی ۔" ۔۱۔

فنکار نے اپنے دور کی ایک حقیقت کو افسانے کے ذریعہ سے بیان کیا ہے ـــــ بچپن کی شادی اور شوہر اور بیوی کی زندگی میں ناآسودگی کوئی نئی بات نہیں لیکن نئی بات جو نظر آتی ہے وہ یہ کہ پہلے عورت کی شرم یا اسکی گھری ہوئی زندگی اس بات پر آمادہ نہیں ہوپاتی تھی کہ کسی کسی قسم کا اظہار کسی دوسر سے کرپائے ! ـــــ اور یہی وجہ ہے کہ مسائل پہلے بھی تھے لیکن ان کو سماجی سطح پر دیکھا نہیں

۱۔ ہمسفر ۔ اقبال متین ۔ (مجموعہ ۔ پٹاریوں کا مداری ص ۱۷۳ ۔ نصرت پبلیشر ۔ لکھنئو ۔

جاسکتا تھا ـــ آج کا ہمارا افسانوی ذہن خاص طور سے متاثر ہے اور فرد کی زندگی کو سماج میں سوچنے سمجھنے اور بولنے کا حق دینا چاہتا ہے ـــــــــــ ایک بکھرے ہوئے انسان کو ، ایک منتشر اور غیر مطمئین عورت کے پارہ پارہ وجود کو ایک سانچہ میں ڈھالکر اسے ایک وجود ، ایک مرتب جسم ، اور لمحئہ حیات عطا کرنا چاہتا ہے ـــــــــ

اقبال متین تھوڑی دیر کے لئے رومانوی محبت کو بھول کر ایک ایسے فرد کو متعارف کرانا چاہتے ہیں جو شہری زندگی سے غیر مطمئین نظر آتا ہے ، صنعتی تہذیب میں خود کو جکڑا ہوا پاتا ہے ، اور دور حاضر کی تنہائی کردار ، شخصیت ، اور مقصد مرگ و حیات کے منہدم ہونے کا عمل ہر لحظہ اسپر طاری ہے ، ایک بھیانک خوف جسکی موجودگی کا احساس ہر وقت ذہن و دل پر سوار رہتا ہے ـــــ ایسے ماحول میں ہی وہ فرد ، اپنی بیوی بچوں اور چھوٹے سے گھر کے تمام اخراجات وہ ایک معمولی سی نوکری کرکے پورا کرتا ہے ـــــ اور اسکی ان تمام پریشانیوں کی وجہ محض اقتصادی بدحالی ہے ـــــ " ننگے زخم" یہ کہانی شہری زندگی کے مختلف سماجی رشتوں کو بیان کرتی ہے ـــــ ایک کردار " میں" جو اسی دور کا ایک شہری باسی ہے ، معمولی سی نوکری کرکے وہ اپنے کنبہ کی ساری ذمہ داری کا بوجھ تنہا اپنے سر لئے ہوئے ہے ۔ یہ کردار یعنی" میں" بے ایمان نہیں ہے ۔ جھوٹا نہیں ہے ، کام چور بھی نہیں ، اور نہ ہی جھوٹی شان دکھاکر خود کو کئی بڑا آدمی ظاہر کرنا چاہتا ہے ـــــ اپنی اقتصادی پریشانیوں کا اظہار وہ کسی کو بھی ہمدرد سمجھ کر آسانی سے کردیتا ہے ـــــ ایسے ہی حالات میں اتفاق سے اسے اسکے

آفس کا ایک ساتھی ملجاتا ہے جسکا اظہار افسانہ نگار نے اسطرح کیا ہے :-

" میں اسی پہاڑ کی بلندیوں تک پہنچنے کی انتھک کوشش میں یخ بستہ ماحول کے درمیان کھڑا ہانپ رہا تھا کہ مجھے ایک پلاری مل گیا ، میرے اس پلاری کا نام تھا جیتندر !! —" ١-

یہ کردار جیتندر کو ایک اچھا کھاتا پیتا اور اونچے گھرانے کا فرد سمجھ کر اپنی پریشانیاں اس امید میں کہ ڈالتا ہے کہ ضرور کوئی حل نکالے گا ! ———

یہاں پھر دو سماجی شخصیتوں کا ٹکراؤ نظر آتا ہے ——ایک طرف جیتندر اور دوسری سمت کہانی کا مرکزی کردار "میں" ——جیتندر اپنے ساتھی کی پریشانی سنکر اسکا حل تلاش کرنے کا وعدہ کرلیتا ہے ——اور مرکزی کردار اسکی اس دوست نوازی پر خوش ہوکر اسکے بارے میں اچھے اچھے خیالات بُننے لگتا ہے :-

" جیتندر کتنا ہمدرد دوست ، کتنا فرمابردار بیٹا ، اور کتنا ذمہ دار بھائی تھا -اسکی شخصیت کی تہ داری آہستہ آہستہ مجھے متاثر کرنے لگی میں انھیں خیالات میں غلطاں تھا کہ یکا یک ایک دیدہ رو اور با وضع بزرگ کمرے میں داخل ہوئے میں تعظیم کو اٹھ کھڑا ہوا -جب انھیں میں نے بتایا کہ میں جیتندر کے لئے آیا ہوں تو وہ کچھ اس نگاہ سے مجھے دیکھ کر لوٹ گئے جیسے میں نے کوئی قصور کیا ہے -" ٢-

---

١-ننگے زخم - اقبال متین - (خالی پٹاریوں کا مداری) ص ٢٣ -نصرت پبلیشر ،لکھنئو-

٢- ایضاً ایضاً ایضاً ص ٢٨ - ایضاً

ابھی تک جیتندر کی حقیقی شخصیت اجاگر نہیں ہوپاتی ہے اور مرکزی کردار جیتندر کے ساتھ ، اس کے مشورے کا مطابق کسی ساہوکار سے سو روپیہ قرض لینے کے لئے چل دیتا ہے ——— لیکن ساہوکار کے پاس عین پہنچنے سے پہلے جب جیتندر اسکی بات کا اظہار کرتا ہے کہ وہ دو سو روپیہ لے لے تاکہ سو روپیہ وہ خود اپنے کام میں لاسکے ——— وہ دوسو روپیہ تو لے لیتا ہے مگر ایک فکر اسکے دماغ میں گھومنے لگتی ہے کہ جیتندر نے تو خود اپنے آپ کو ایک مطمئین کھاتا ، پیتا اور پیسے والا انسان بتایا تھا پھر یہ سو روپئے ! ؟ ——— اور آخر کار کہانی کے آخیر جملوں سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ وہ بھی ایک غریب پریشان انسان ہے اسکی ماں جس گھر میں کام کرتی ہے اسکو انسے اپنا گھر بتایا تھا ——— یہاں دو شخصیتیں ایک ہی سماج سے دو مختلف رشتہ رکھتی ہیں ——— ایک رشتہ سچائی دیانت داری ، اور خلوص کا ہے ، اور دوسرا فریب ، دھوکہ ، مطلب پرستی کا ہے ——— ہمارا آج کا سماج ایسے بہت سے مسائل سے دوچار ہے ——— اس افسانہ میں فنکار کو بحث اس بات سے قطعاً نہیں ہے کہ وہ نئے سماج کے حق یا مخالفت میں کوئی صفائی پیش کرے بلکہ سماج میں پیدا ہونے والے اچھے اور برے رشتوں کا ہمدردی کے ساتھ مطالعہ کرتا ہے ۔ایک زندہ صورت حال کے ان نقوش کو ترتیب دینا ہے جو ہمارے سامنے ابھر رہے ہیں ! ! ——— اپنی ایک اور کہانی میں اقبال متین نے سماجی رشتہ کی ایک اور شکل دکھائی ہے ۔یہاں سماجی زندگی فکری اعتبار سے ایک قسم کے تذبذب اور ایک طرح کی ذہنی پریشانی و پراگندگی میں مبتلا نظر آتی " درد کا رشتہ " ——— یہ افسانہ شہری زندگی پر شخصیت کی مختلف اور الگ الگ صورتوں کو واضح کرتا ہے ——— ایک فرد ، شہری اور سماجی ذمہ داریوں میں گھرا ہوا

انسان ، جسے اپنی سفید پوشی کا بھی خیال رکھنا ہے اپنے بال بچوں کا پیٹ بھی بھرنا ہے اور تفریحی مشاغل میں حصہ بھی لینا ہے کس طرح حالات کے گرد اپنے آپ کو ٹکڑوں ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتا ہے ——— دوسری طرف اسی سماج کا ایک اور انسان ، یعنی ایک عورت اپنی بکھری ہوئی منتشر اور بے نقاب زندگی کو اپنی بے ترتیب حرکتوں سے ایک مرکز ، اور ایک نقطہ پر لاکر ایک اکائی کی شکل دیدیتی ہے — یہ اکائی ایک خدا کے مانند ہر ایک ضرورتیں پوری کرتی ہوئی خود بالکل بے نیاز نظر آتی ہے ——

کہانی کا ایک کردار گھوڑ دوڑ میں پیسے کی بازی لگانے پہنچا ہوا ہوتا ہے ——— گھوڑ دوڑ میں بازی لگانے کا کچھ تو اسے چسکا پڑ چکا ہوتا ہے اور کچھ اس میں اسکے جیت جانے کی لالچ بھی ہوتی ہے ——— یہ کردار اسی سماج کا ایک بال بچوں والا شخص ہے جو اپنی اقتصادی پریشانیوں کے باعث بہتوں کا قرضدار بھی ہوچکا ہے اور مکان کا کرایہ کی ادائیگی اسکے لئے ایک اہم مسئلہ بنی ہوئی ہے — یہ ایک متوسط درجہ کا باعزت انسان ہے ——اس انسان کی ملاقات ایک بار ریس کورس میں " تاجی " سے ہوجاتی ہے جسے وہ پہلے سے بھی جانتا ہے :-

" جب میں لوٹ رہا تھا تو عورتوں کی قطاریں تاجی مجھے اشارے سے بلا رہی تھی - تابی بڑی خوبصورت لڑکی ہے ، بہت حسین ، اپنا جسم بڑے سلیقے سے برتتی ہے اور حتی المقدور اپنے جسم کی حفاظت کرتی ہے ——— لیکن خود تابی کی اپنی نہ کوئی زندگی تھی ، نہ کوئی روح ، جو کچھ تھا بس جسم تھا اور چہرہ تھا — ایسا جسم اور چہرہ جو ہر کسی

کی زندگی بن سکتا ہے اور ہر کسی کی روح ۱۱ —"۱۔

تو یہ تھی تاجی جو اب کہانی کے ہیرو کے ساتھ تھی —ہیرو بے چارہ اپنی ذہنی الجھنوں میں غلطاں وپیچاں یہ سوچ رہا تھا کہ گھر پہنچکر اب سب سے اہم قرض گھر کے کرایہکی ادائیگی کیسے ہوگی لیکن پھر بھی وہ تاجی کے حسن کا دلدادہ تھا —تاجی کا پیشہ صرف مردوں کا دل لبھانا اور خوبصورت جسم اور نظروں دار کر کے پیسہ کمانا تھا —آج تاجی بھی کسی فکر میں تھی اسے اپنے بھائی کے کالج کی فیس کے لئے کچھ روپیوں کا انتظام کرنا تھا اسنے کسی سیٹھ سے آنکھیں لڑائیں اور پیسہ کا انتظام ہوگیا —پھر وہ تھوڑی دیر کے لئے ہیرو کے ساتھبیٹھ کر کسی ہوٹل میں آرام سے باتیں کرتا چاہتی تھی کہ اسکی نظروں نے اپنی جسم پر ایک اور مرد کی نظروں کو چبھتا ہوا محسوس کیا —یہ وہی مرد تھا جو ہیرو کے گھر کا مالک تھا جسکو آج کرایہ ادا کرتا اسکے لئے لازم سا ہوگیا تھا — یہ خبر تاجی کو بھی ہوگئی -تاجی نے ہیرو سے تھوڑی دیر کے لئے رخصت چاہی اور پھر کچھ وقفہ بعد شام کو جب ہیرو کی نظر تاجی پر پڑتی ہے تو وہ جس گاڑی سے اتر رہی ہوتی ہے اس میں اسکے مکان کا وہی مالک بیٹھا ہوا ہوتا ہے —— تاجی اپنی خالی خالی مگر مخلص نظروں سے ہیرو کی طرف دیکھتا ہے اور اسکے ہاتھوں میں سو روپیہ رکھ کر بڑی بے فکری کے ساتھ اسے اکیلا چھوڑ دیتی ہے — کہانی یہیں پر ان جملوں کے ساتھ ختم ہوجاتی ہے :-

"تمہیں اس سے کیا —جو ہونا تھا ہوچکا اور ، اور پھر ،

۱۔درد کا رشتہ -اقبال متین - (خالی پٹاریوں کا مداری) ص ۱۷۶-نصرت پبلیشر ،لکھنئو۔

اس نے تھرائی ہوئی آواز میں کہا —تمہارا مجھ سے
رشتہ ہی کیا ؟ ——وہ موٹر میں سوار ہوچکی تھی —
میں نے ہاتھ بڑھاکر نوٹ اس کے قدموں میں پھینک دینا
چاہا ؛ لیکن وہ موٹر کے بند دروازے کا شیشہ چڑھا چکی تھی -
موٹر بڑھنے لگا تو میں نے شیشے میں سے دیکھا -تاجی نے
اپنی ساری کا پلو اپنی آنکھوں پر رکھ لیا تھا !! ——
میں بیچ سڑک پر کھڑا سوچتا رہا واقعی میرا اور تاجی کا رشتہ
ہی کیا ہے ؟ بس اسی قدر تاکہ میں ہمیشہ اس سے ملکر اداس
ہوجاتا ہوں !! —" [1]

یہ کہانی یقیناً ایک نیا موضوع لئے ہوئے ہے انسانی رشتوں کی شکلیں بدلتے ہوئے سماجی اقدار اور شہری ضرورتوں کی بنیاد پر استوار ہیں !

—— xxx ——

۱-درد کا رشتہ -اقبال متین - (خالی پٹاریوں کا مداری) ص ۱۹۷-نصرت پبلیشر ،لکھنئو

رام لعل :-

رام لعل اردو کے ان افسانہ نگاروں میں ہیں جنھوں نے خاصی تعداد میں افسانے لکھے ہیں ۔عصری ادب کے دسمبر ۱۹۷۰ء کے شمارے میں خود انکا بیان ہے گذشتہ دس برس میں میں نے سو کے قریب افسانے ضرور لکھے ہیں ۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس زود نویسی نے اردو افسانے کے موضوعات میں کیا تبدیلی کی اور کس طرح انھوں نے اپنے افسانوں کے ذریعہ افسانے کے فن اور تکنک میں کیا کیا اضافے کئے ـــــ انکے افسانوں کے ذریعہ میں " اوسی " " ایک شہری پاکستان کا " اور قہر یہ وہ افسانے ہیں جنکا ذکر بار بار افسانوی تنقید میں آتا رہا ہے اور افسانہ نگار خود انہیں قابل ذکر سمجھتا رہا ہے ـــــ لیکن ان افسانوں سے الگ ہٹ کر اگر دوسرے افسانوں کا ذکر کیا جائے تو ان میں " چراغوں کا سفر " مجموعہ کے چند افسانے سامنے آئیں گے ! اس مجموعہ کے تعارف کے طور پر افسانہ نگار نے "آٹھ اور آٹھ کے عنوان " سے جو باتیں پیش کی گئی ہیں ان سے افسانوں کو سمجھنے میں خاص مدد ملتی ہے ۔آٹھ افسانوں کا تعلق اس نسل سے ہے جو پریم چند کے فوراً بعد آئی اور دوسرے آٹھ افسانے جنھیں شعوری طور پر نئے علامتی انداز میں پیش کیا ہے اور اسے صنعتی نظام کی پیداوار بتایا ہے ـــــ رام لعل کے وہ افسانے زیادہ دلکش ہیں جن میں کم سے کم الفاظ میں اور رواں شستہ نثر کے ذریعہ بات کہی گئی ہے ـــ بعض افسانوں میں معمولی موضوع کے ساتھ انھوں نے اپنے فن کا وظاہرہ کیا ہے ـــــ مثال کے طور پر افسانہ " آنگن " ہے جن میں بدلتے ہوئے سماج اور اسکی ضرورتوں کو بڑی فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ پیش کیا ہے ۔ایک چھ کمروں کی بنی عمارت کے بڑے

سے آنگن کا پارٹیشن کرکے بیوی اسے کرایہ پر اٹھانا چاہتی ہے تاکہ آمدنی میں اضافہ ہو لیکن شوہر ایسا نہیں کرنا چاہتا ـــــ اسکی دو وجہیں ہوتی ہیں پہلی تو وراثت میں ملے اس مکان میں وہ کسی طرح کی تبدیلی نہیں چاہتا کیونکہ اس آنگن سے اسکی کتنی ہی بری یادیں وابستہ تھیں اور دوسری وہ مکان سماجی رشتوں کو مضبوط کرتا تھا ۔اس آنگن میں کتنی ہی شادیوں اور تیوہاروں میں لوگ ایک دوسرے سے قریب ہوتے تھے ۔یہ آنگن آپسی میل ملاپ کی ایک یادگار تھا ۔جسکو بانٹنا اس شخص کے لئے نا ممکن تھا ـــــ مگر بیوی کے پاس نہ تو سماجی ضرورتوں کا احساس ہوتا ہے اور نہ اس کے پاس یادوں کا کوئی خزانہ ہوتا ہے ـــــ اسے صرف اپنی مالی حالات کی بہتری کی فکر ہوتی ہے ـــ لیکن عین اس وقت جبکہ شوہر کا کردار آنگن کی تبدیلی پر اپنے چاروں طرف ویرانی اور اداسی محسوس کررہا ہوتا ہے کہ دروازے پر دستک ہوتی ہے :

" بھئی معاف کرنا نریندر ـ تمہیں ناحق تکلیف دی
در اصل میں یہ کہنے آیا ہوں کہ مجھے اب اس آنگن کی
ضرورت نہیں پڑے گی کیونکہ پونش اور شیکھر نے صرف
چار چھ جنوں کے سامنے بغیر کسی غل غپاڑے کے
شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے ۔میں نے بھی منظوری
دے دی ہے ۔آخر اسمیں حرج بھی کیا ہے ؟ بہرحال
آپ کے کوآپریشن کا بہت بہت شکریہ ا ۔" ۱۔

۱۔ آنگن ۔ رام لعل (مجموعہ چراغوں کا سفر) ص ۲۳ ۔دسمبر / ۱۹۶۶ء

اس کردار کی مختصر باتوں سے جیسے سماج کی ساری تبدیلیاں سامنے آگئیں ! ایک طرف شادی کی رسموں کی دھوم دھام کی جگہ سادگی کا احساس ہوتا ہے اور دوسری طرف والدین کی رضامندی بھی سامنے آتی ہے ——— اور اس طرح نریندر کا مزاج خود بدلنے پر آمدہ ہوجاتا ہے ——— وہ پرانی یادوں اور سماجی ضرورتوں کے گھیرے سے نکل کر بیوی کا ہم خیال ہوجاتا ہے ———

" میں نے مسکرانے کی کوشش کی — اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا ——— تم بلاوجہ ہی ناراض ہوگئیں - نیٹو ! چلو چائے پلواؤ - پھر بیٹھ کر اس آنگن کا نقشہ بدلنے کا اسٹیمیٹ بنائیں گے !! -" ۱-

اس مختصر سے افسانے میں سماج کی بدلتی ہوئی قدروں کو آسان نثر میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے ——— رام لعل کے بعض افسانوں میں جزوی کمزوریوں کا احساس ہوتا ہے - ایسے افسانوں کا ذکر بھی نا مناسب نہیں جن میں انکا ایک افسانہ ہے " سفر مسلسل " - سفر مسلسل کا موضوع یوں بظاہر تو ایک بوڑھے آدمی کا دکھ درد ہے جو نالائق اولادوں کی وجہ سے دنیا سے نالاں و پریشان ہوتا ہے لیکن ایک لڑکی کا کردار قاری کی توجہ کا مرکز بنتا ہے - جو کم پڑھی لکھی ہونے کی وجہ سے سسرال میں جگہ نہیں پاتی اور باپ کے دکھوں میں مزید اضافہ کرتی ہے ——— " میں " یعنی جس کردار کے ذریعہ یہ سارا واقعاتی افسانہ سنایا گیا ہے وہ ٹرین کے سفر میں اس بوڑھے اور اسکی لڑکی سے ملتا ہے ——— بوڑھا اپنی تمام زندگی کی محرومیاں کچھ اسطرح سناتا ہے اور اپنے پانچ لڑکوں کا ذکر اس انداز سے کرتا ہے کہ افسانے میں غیر یقینی فضا پیدا ہونے لگتی ہے —

آنگن - رام لعل - (مجموعہ چراغوں کا سفر) ص ۲۲

پانچوں لڑکوں کا نالائق ہونا نا ممکن تو نہیں لیکن جس انداز سے انکے تعارف کرائے گئے ہیں وہ عام زندگی میں کم دیکھے جاتے ہیں — ارجن کا ذکر ایک طرف ذہین، محنتی اور خوش اخلاق شخصیت کے ساتھ کیا جاتا ہے اور پھر وہ بوڑھے باپ کا خیال لئے بغیر پاکستان جاکر مسلمان ہوجاتا ہے — دوسرا لڑکا خوب پڑھ لکھ کر پاگل ہوجاتا ہے — اور آخر کار مر جاتا ہے — تیسرا لڑکا کم پڑھا لکھا فلم اسٹار بننے جاتا ہے اور پھر غیر قانونی حرکتوں میں جیل جاتا ہے اور اب وہ بوڑھے باپ کے لئے مرا زندہ برابر ہے ——— اگلے دو اور لڑکوں میں ایک شادی کے بعد صرف بیوی کے ~~ذریعے~~ لئے میں رہتا ہے اور پانچواں لڑکا شروع سے والدین کی نفرت کا نشانہ بنتا ہے ——— غرضکہ ان پانچوں لڑکوں کے بیان سے اگر قاری یہ سمجھنا چاہے کہ ان کرداروں کے بگڑنے میں انکا ماحول پرورش اور سماج کس حد تک ذمہ دار ہے تو اسکے لئے افسانے نگار نے کوئی ایسا ماحول نہیں پیش کیا جس سے کردار کی نفسیات کا جائزہ لیا جائے ا یہ سارے کے سارے کردار کیوں ایبنارمل ہوتے ہیں ؟ اسکا بھی قاری کوئی حل تلاش نہیں کرسکا ہے اسطرح افسانہ میں قصہ گوئی کی سی فضا پیدا ہوگئی ہے ———

لیکن بوڑھے آدمی کی موت کے بعد اسکی لڑکی اور افسانہ بیان کرنےوالا کردار جہاں سے ساتھ ہوتے ہیں وہ افسانہ کا اہم حصہ ہے ——— لڑکی کا آخری سہارا اسکا باپ جو بہت پہلے بیماری کا شکار تھا اپنے لڑکوں کا ذکر کرتے کرتے کھانسنے لگتا ہے اور یہاں تک وہ بید م ہوکر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے ——— اور پھر یہ دونوں کردار ذہنی طور پر ایک ہوجاتے ہیں کیونکہ لڑکی کے سامنے اب کوئی راستہ نہیں ہوتا پھر بھی ہندوستانی عورت کے ناطے وہ اس حادثہ کی خبر اپنے شوہر کو کراتی ہے — ———

اور یہ بھی جانتی ہے وہ ہرگز نہ آئے گا دو ہمسفر کی منزل ایک نقطہ پر آجاتی ہے —

نوجوان اپنی زندگی میں طرح طرح کے رنگ بھرنے لگتا ہے ۔لڑکی اب تک کسی فیصلہ پر پہنچنے سے قاصر تھی ـــــ عین اس وقت جب کہ یہ دونوں اپنی ایک منزل کا سفر شروع کرنے جارہے ہوتے ہیں کہ اسکا شوہر پہنچ جاتا ہے اور اس طرح لڑکی بھٹکے ہوئے راستہ سے منزل پر پہنچ جاتی ہے ۔اور اس کے ساتھ افسانہ ختم ہوجاتا ہے ـــــ صرف انداز بیان نے اس افسانے کو موثر بنایا ہے ورنہ نہ تو موضوع میں کوئی نیاپن ہے اور نہ ہی کردار نگاری کی کوئی اہم مثال زبان کی شستگی اور روانی کے افسانے میں دلچسپی قائم کی ہے ـــــــ

رام لعل کے بیشتر افسانوں میں گھریلو زندگی کی عکاسی ہے جس میں کبھی مرد لاپرواہ ہے اور غیر ذمہ دار ـــ اور کبھی عورت نا سمجھ اور کم فہم ہے ـــ ـــ " تمہارا فیصلہ کیا ہے" ؟ میں ، لاجونتی کا شوہر ازدواجی زندگی کی ذمہ داریوں سے آزاد ہی نہیں بلکہ وہ بیوی بچوں کی روشی تک چھیننے سے پرہیز نہیں کرتا ـــ طویل مدت کے بعد جب وہ گھر آتا ہے تو اسکی بیوی لاجونتی کی خوشیوں کی انتہا نہیں ہوتی ـــــ وہ شوہر کی غیرموجودگی میں کندن لال کو ایک بہت بڑا سہارا محسوس کرتی ہے مگر اتنی لاپرواہی کے بعد بھی شوہر کی محبت اسکی عزت بیوی کے دل میں کم نہیں ہوتی ۔وہ اپنے سامنے شوہر کو دیکھ کر تمام دکھ بھول جاتی ہے ـــــ ایک مدت کے بعد دونوں کی رات بڑے آرام سے سکھ کی نیند میں گزر بسر ہوتی ہے ـــ لاجونتی سمجھتی ہے شاید اب اسکا شوہر اس سے جدا نہ ہوگا ـــ لیکن شوہر لاجونتی کی بچی کچی دولت لیکر کب کا دور ہوچکا ہوتا ہے اور لاجونتی پھر تنہاں ہوجاتی ہے ـــــــ !!

اس افسانے میں شوہر کے کردار میں افسانہ نگار نے مرد کی ایسی شخصیت پیش کی ہے جو حالات کی بہتری میں کسی طرح کی کوشش نہیں کرتا ـــ اسکی ایک

وجہ دولت کی زیادتی کے بعد کمی ہے اور دوسری بیوی کی بے توجہی ــــــــــ لاجونتی خود شوہر کی بربادی کی وجہ جانتی ہے ـــــ وہ سوچتی ہے :

" ـــــ اپنے شوہر کے کردار کو بگاڑنے میں
خود اسکا بھی ہاتھ تھا ــ اس نے پوری سچائی سے اپنے کردار
پر نظر ڈالی ــ گذشتہ بارہ سالوں میں اس نے ایک بار بھی اس
قسم کی کوئی کوشش نہ کی تھی جو اس کے شوہر کو پستی کے
کڈھے میں گرنے سے بچاسکتی ـــــ" ۱ـ

اکثر عورت کی بے توجہی مرد کو غلط راستوں پر جانے کے لئے مجبور کرتی ہے اس موضوع کو دوسرے افسانے " لمحوں کی دہلیز" میں بھی ایک دوسرے انداز سے پیش کیا ہے ـــــ تمہارا فیصلہ کیا ہے ؟ کی لاجونتی کی طرح اس افسانے میں بیوی کا کردار شوہر کی غلطیوں کو در گزر نہیں کرتا شاید اسلئے کہ اب وہ سوم ـــــ اور لوجی جیسے دو جوان بچوں کی ماں تھی ــ اور لاجونتی کے شوہر کی طرح " لمحوں کی دہلیز" کا شوہر بے حس نہیں ہوتا کیونکہ اسے جوان بیٹی کی بھرپور محبت حاصل تھی اور اسطرح یہ دو ملتے جلتے افسانے سماج کے ایسے دو گھروں کے ماحول میں پیش کئے گئے ہیں جہاں مرد اور عورت کسی ایک میں بھی ازدواجی زندگی گزارنے کا سلیقہ نہیں ہوتا ـــــ ماحول اور حالات کے ساتھ کردار کچھ اس طرح ہمارے سامنے آئے ہیں کہ کسی کردار سے مکمل طور پر ہمدردی نہیں ہوپاتی ـــــ ازدواجی زندگی سے ہٹ کر کچھ افسانوں میں صرف عشق و محبت کے موضوع بھی پیش کیا گیا ہے گزرتے لمحوں کی چاپ میں دو کرداروں کے عشق کی کہانی اسطرح بیان کی ہے کہ قاری جسمیں

۱ـ تمہارا فیصلہ کیا ہے ؟ ـ رام لعل (چراغوں کا سفر) ص ۱۱۵ ـ

کردار اور انکے ماحول سے اچھی طرح آگاہ نہیں ہوپاتا ـــــ لڑکا کانپور میں رہ جاتا ہے اور لڑکی تقسیم ہند کے بعد نہ صرف پاکستان چلی جاتی ہے بلکہ مغربی ملکوں میں بھی زندگی گزارتی ہے ـــــ اور چودہ سال کے بعد جب لڑکی ہندوستان واپس آتی ہے تو فوراً اپنے محبوب صدیق کو فون کرتی ہے اور وہ پہلی آواز پر بغیر کسی جھجک کے اسے پہچان بھی لیتا ہے انکی ملاقات کانپور کے کوالیٹی ہوٹل میں ہوتی ہے جہاں بیٹھ کر یہ لوگ گھنٹوں اپنی اپنی زندگی کی گزری باتوں کا ذکر کرتے ہیں ۔ لڑکی کے کردار میں ثریا کو ڈاکٹر ، رائٹر ، لیکچرر بنایا جاتا ہے مگر اسکی شخصیت میں خود کوئی ایسی جاذبیت ، قابلیت نظر نہیں آتی جس سے قاری خود اسکی شخصیت کو اعلیٰ تعلیم یافتہ سمجھ سکے ۔ یورپ اور لندن میں رہنے کے بعد اسکی شخصیت میں اتنی تبدیلی تو ضرور آتی ہے کہ گھنٹوں وہ کانپور جیسے شہر میں کوالٹی میں اپنے پرانے عاشق کے ساتھ شراب پیتی ہے اور " مسز مارکنڈے " بن جانے پر بھی وہ صدیق سے اس طرح ملتی ہے اور ایسی باتیں کرتی ہے جس سے نہ تو اسکی قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے اور نہ ہی پتہ چلتا ہے کہ وہ ہندوستان کی تہذیب سے واقف ہے ہوٹل کی ملاقات میں سارا افسانہ بیان کردیا گیا ہے ـــــــــــــ کرداروں کی زبان ان کی شخصیت کی عکاسی نہیں کرتی وہ اس ملاقات میں باتوں کے درمیان شراب پیتے رہتے ہیں اور سطحی جذبات کی عکاسی کرتے ہیں ـــــ ان باتوں کے درمیان جہاں کہیں بھی سیاست کا ذکر کیا گیا ہے وہاں ایسا لگتا ہے جیسے موضوع سے ہٹ کر افسانہ نگار نے اچانک کوئی جملہ لکھ دیا ہے ۔ ثریا ہندوستان میں پیدا ہوئی اور پچیس جوان ہوئی ـــ اسکے بعد وہ پاکستان جاتی ہے لیکن انگلستان کی شہری بنتی ہے اور اپنی جائے پیدائش سے محبت کرتی ہے وہ باتوں کے دوران کہتی ہے :ـــ

" ------ میں یہیں پیدا ہوئی تھی اور مرنا بھی
یہیں چاہتی ہوں —" ۱-

اس کے باوجود یہ کردار ہندوستان کی تہذیب و تمدن سے بے خبر ہوتا ہے نہ اسے خود شراب پینے میں جھجھک محسوس ہوتی ہے اور نہ ہی وہ اپنے عاشق کو شراب پینے سے باز رکھ پاتی ہے ——وہ شادی کے بعد بھی اسی طرح غیر مرد سے آزادانہ باتیں کرتی ہے جیسے وہ ہندوستانی بیاہتا عورت کی تہذیب سے بے خبر ہے ——جہاں کہیں بھی اس کردار کا کوئی نظریہ پیش کیا گیا ہے وہ بھی اسکی اپنی شخصیت کو ظاہر نہیں کرپاتا ——ایک جگہ قومیت کا نظریہ یوں پیش کرتی ہے ——

" یہ قومیت ہمارے زمانہ کی سب سے خطرناک بیماری ہے - میرا
یقین ہے اگر ہم خود کو ساری دنیا کے شہری محسوس کرسکیں
تو یہ دنیا کتنی پیاری بن سکتی ہے ! "- ۲-

یہ نظریہ رکھنے والا کردار خود کو انگلستان کا شہری کہلاتا ہے اور ہندوستان کی سر زمین پر مرنا چاہتا ہے ——— " گزرتے لمحوں کی چاپ" کے لطیف نازک تاثر کی جگہ قاری دونوں کرداروں کی کانپور جیسے کارخانوں کے شہر میں ایک ہوٹل میں طویل ملاقات کی تمام اوٹ پٹانگ باتیں سنتا رہتا ہے ——انجام میں بھی کوئی تاثر پیدا نہ ہوا کیونکہ دونوں اپنے راستوں پر چلے گئے ! ———ان افسانوں

۱-گزرتے لمحوں کی چاپ -رام لعل ! ص ۱۹ - ۱۹۷۲ء
۲- ایضاً ایضاً ص ۱۷ - ۱۹۷۲ء

کے علاوہ رام لعل نے کچھ افسانے مختصر اور کسی حد تک علامتی لکھے ہیں ان میں افسانہ نگار کسی حد تک کامیاب بھی ہوا ہے ـــ جاگیردارانہ نظام کے بعد صنعتی نظام نے انسان کی زندگی میں کتنی بڑی تبدیلی کی ـ کس طرح یکجا خاندان کا شیرازہ بکھرا اور مشین و کارخانوں نے کس طرح افسانوں کو مختلف شہروں میں بکھیر دیا ـ اس میں نیا نوجوان کس طرح رچ بس گیا اور بزرگوں کو کس طرح بکھرے ہوئے شیرازہ پر ماتم کرنا پڑا ـــــــ اس موضوع کو رام لعل نے "شیرازہ" میں بڑے موثر انداز میں بیان کیا ہے ـ بوڑھا آدمی اپنے چار بیٹوں کے رہنے کے لئے بڑا آرام دہ اور کشادہ مکان بنواتا ہے جسمیں وہ اپنی زندگی کی ساری کمائی لگا دیتا ہے تاکہ اسکی آنکھوں کے سامنے اسکی اولاد رہے اور وہ انکے سکھ دکھ میں برابر کا شریک رہے ـــــــ مکان کی تیاری کے بعد چاروں بیٹوں کو بلواتا ہے اور جشن مناتا ہے ـــ اس کے بعد وہ چاروں لڑکوں کے ہاتھوں میں وصیت نامہ دیتے ہوئے کہتا ہے ـــــــ

" ـــــــ زندگی کا تو کوئی بھروسہ نہیں ہے اب تم لوگ
جلدی سے یہاں آکر بس جاو ـ میری آنکھوں کے سامنے ـ
جس گھر کو بنوانے میں میں نے اپنی پوری پونجی صرف کردی ہے
اس میں تم سب کو رہتے ہوئے بھی تو دیکھ لوں ـــ" ـ۱ـ

اور اسکے بعد یکے بعد دیگر سے چاروں بیٹوں نے اپنی اپنی مجبوریاں سامنے رکھیں ـــ بڑے لڑکے نے بتایا وہ کلکتہ کی پرائیویٹ فرم میں ملازم ہے اگر چھوڑ کر آجائے گا تو اسکے بچوں کی تعلیم کی آسانیاں بھی یہاں نہیں ملیں گی ـــ دوسرے لڑکے کی کمپنی کی شاخیں بمبئی ، بینگلور ، مدراس اور مدرائی میں ہیں وہ ان جگہوں کے علاوہ نہیں جاسکتا ـــ تیسرا لڑکا بھلائی کے کارخانہ میں ملازم تھا اور چوتھا لڑکا کہتا ہے

۱ـ شیرازہ ـ رام لعل (مجموعہ چراغوں کا سفر) ص ۱۷۶

میں ناگپور میں سائنس کے سبجیکٹ میں ریسرچ کرنا چاہتا ہوں -شاید وہیں رہتے رہتے بس بھی جاؤں ——— اور اس طرح کارخانے مشین اور انسان کا رشتہ قریب سے قریب تر ہوتا گیا ہے اور خاندان کا شیرازہ بکھرتا گیا ہے ——— اور نئی نسل کو اس بکھرے ہوئے شیرازہ کا کوئی غم بھی نہیں ——— انڈسٹریل نظام صرف زندگی کا شیرازہ ہی نہیں بکھیرتا بلکہ نہ جانے کتنی برائیوں کو جنم دیتا ہے ——— سماج کا ایک طبقہ وہ تھا جس کا ذکر " شیرازہ " میں ہوا ہے جنکو کاروبار ایک آرام دہ مکان میں نہیں رہنے دیتے ——— اسی سماج کا ایک طبقہ وہ بھی ہے جس میں لوگ کوٹھریوں میں ٹاٹ کا پردہ ڈال کر جیتے ہیں ——— اندھیری گلیوں میں لوگ دروازہ پر چارپائیاں ڈالکر سوتے ہیں -مرد روزی روٹی کے چکر میں آدھی رات تک غائب رہتے ہیں اور انکی بیویاں انجانے میں غیر مرد کی جنسی بھوک کا شکار ہوتی ہیں ———

" کن کھجورا " افسانہ کا کردار ایک ایسے ہی شخص کی عکاسی کرتا ہے جہاں ہمیشہ اسے اپنے جذبات کچلنے پڑتے ہیں ——— ایک ہوٹل کا معمولی ویٹر اس افسانے کا مرکزی کردار ہے جسکے ذریعہ پورا افسانہ بیان ہوا ہے -کردار کے ماحول اور نفسیات کی عکاسی بڑی خوبی سے ہوئی ہے ——— ایک ویٹر جس کا واسطہ صبح سے شام تک نہ جانے کتنے صاحبوں سے پڑتا ہے وہ انکے بارے میں سوچتا ہے ——— جو ٹپ نہ دینے کے لئے کس کس طرح بچنا چاہتے ہیں اور جو دیتے بھی ہیں وہ جیسے اسکے منہ پر طمانچہ مارتے ہیں ——— مندرجہ ذیل لکھے ہوئے چند جملوں میں ویٹر کی مجبور نفسیات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے ———

"------ اور کوئی چند پیسے چھوڑ کر اس طرح منہ بناتا ہے

جیسے منہ پر طمانچہ لگانے کی حسرت اسکے د ل ہی د ل
میں رہ گئی ہے میرے سیاہ کلین شیو جھریوں والے چہرے پر ایسے
کتنے ہی طمانچوں کے نشان ہیں - میں جنبڑے پلاکر خلا میں
گھورنے لگتا ہوں — چھوٹتے ہوئے پیسہ واپس کرتے ہوئے بھی
نہیں بن پڑتی ——— صاحب لوگ کے ناراض ہوجانے کا خطرہ
رہتا ہے اور جب صاحب لوگ ناراض ہوتے ہیں تو ماتھر صاحب
بھی ناراض ہوجاتے ہیں تو گھر بار بیوی اور سارا شہر ایک
چکر کی مانند گھومنے لگتے ہیں —" ۱-

یہ کردار اپنے چہرے پر طمانچوں کے نشان محسوس کرکے جبڑے پلاکر خلا
میں گھور تو سکتا ہے مگر زبان سے اف نہیں کرسکتا کیونکہ اس کے سامنے صاحب کی ناراضی
کے بعد گھر بار بیوی اور یہاں تک سارا شہر گھومنے لگتا ہے - اس کردار کی محرومی
یہیں پر ختم نہیں ہوتی وہ تھکا ماندہ گھر پہنچتا ہے تنگ و تاریک گلی میں پہنچکر
اس علاقہ کے مکان اور اپنی رہائش کے بارے میں بتاتا ہے ———

" لکھوری اینٹوں والے گرے پڑے مکانوں کے ایک کمرے کے کئی
مکان ہیں بنا دروازوں کے - ہر دروازے پر ٹاٹ کے پردے لہرایا
کرتے ہیں - یہاں ٹاٹ زندگی کا ایک ضروری جز ہے - لیکن ٹاٹ
لگاکر بھی کچھ نہیں چھپا پاتے — " ۲-

گھر پہنچکر وہ بڑے آرام سے حسب معمول بیڑی پیتا ہے اور اسے بجھاکر بیوی

۱- کن کھجورا - رام لعل (چراغوں کا سفر) ص - ۱۵۲

۲- ایضاً - ایضاً ایضاً ص ۱۵۲

سے قریب ہونا چاہتا ہے ——

" وہ میرے ہاتھوں کا لمس پاتے ہی اٹھ کر بیٹھ گئی - بولے سے غرّائی - " کیا ہوگیا ہے تمہیں؟ " کچھ کھا وا لیا ہے ؟ "

کتنی بار میری ہڈیاں چچوڑوگے ؟ ابھی ابھی تو میرے اندر رکھا ہی کیا ہے ؟

" —— میرے بدن پر کوئی کنکھجورا رینگ گیا ہو جیسے غصہ سے بے قابو ہوکر پھٹ پڑا - کیا بک رہی ہے ؟ میں تو ابھی چلا ہی آ رہا ہوں — "

اور پھر جیسے اس کردار کے بدن کی جلد میں کن کھجورے نے اپنے نکیلے پاؤں گڑا دئیے اور اسے وہ حادثہ یاد آنے لگا جب اس نے کسی بدن پر کن-کھجورے کو آگ سے جلاکر الگ کرتے دیکھا تھا ——— اسکی تڑپ اور بے چینی اسکی آنکھوں کے سامنے گھوم گئی ——— موضوع اور ماحول کی عکاسی کے علاوہ افسانے کے اختصار اور شستہ رواں نثر نے اس افسانے کو انفرادیت بخشی ہے — افسانہ ختم ہوجانے کے بعد بھی اس طبقہ کا ماحول اور اس میں رہنے والے انسانوں کی گھٹی گھٹی زندگی قاری کو نظر آتی رہتی ہے ——— بیوی کے چند جملے جس طرح اس کے ذہن میں چبھ

۱-کن کھجورا -رام لعل (چراغوں کا سفر) ص ۱۵۲

کئے تھے اس کے لئے کن کھجورے کی مثال بڑی مناسب ہے ۔جس سے قاری کو اس کردار کی بے چینی اور تکلیف کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے ——————

ان افسانوں کے علاوہ علامتی افسانوں میں افسانہ " دودھ " قابل ذکر ہے ——

سر زمین ہندوستان پر مختلف نسلوں نے حکومت کی ہے ۔ہر نسل نے اس زمین سے پیار بھی کیا ہے اور اس سے بہت کچھ حاصل بھی کیا ہے ——اور خود اپنی تہذیب و تمدن کے اثرات بھی دئے ہیں اور ہندوستان نے انہیں قبول بھی کیا ہے ۔ساتھ ہی اپنی زبان اور تہذیب و تمدن پر آنچ نہیں آنے دی ——————اس افسانہ کو عورت ، مرد اور اسکے بچے کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے ——عورت اس سے پہلے بھی چار مردوں کو اپنا چکی تھی جنکی یادگاریں اسکے پاس انکے بچوں کی شکل میں تھیں ۔ یہ پانچواں شوہر سفر سے لوٹتے وقت اپنے بیٹے کے بارے میں سوچ رہا ہوتا ہے کہ اب وہ پیاری پیاری باتیں کرتا ہوگا ——لیکن جب وہ بچے کو پیار سے گود میں لیتا ہے تو :-

" بچہ اپنی ماں کی گود میں جانے کے لئے مچل اٹھا رونے لگا تو باپ نے اسے پچکارا ۔ " کیوں؟ کیوں؟ کیا ہوا میرے بچے کو ؟ تم میری گود میں رہو نا میں تمہارا باپ ہوں " ——بچہ نے اپنی ماں کو پکارا اس سے اپنے اجنبی باپ کے بازوؤں سے نکال لینے کے لئے کہا ——باپ نے اسکی آواز سنی مگر اسکی زبان نہ سمجھ سکا ——بہت حیران ہوا پھر کسی قدر غصہ میں آکر کہا ۔ تونے اسے بھی اپنی زبان سیکھادی ؟ میری زبان کا ایک لفظ تک نہیں سکھایا ۔" ۱ ۔

" عورت نے اپنے مرد کی طرف بڑی عجیب نظر سے دیکھا جس میں قناعت تھی ۔ایک انوکھا صبر ——آنکھوں میں آنسوں لاکر بولی اس نے میری چھاتی کا دودھ پیا ہے ۔اس بات کو تم کیوں بھلا

رہے ہو — " -۱-

عورت کے کردار کو سر زمین ہندوستان کی علامت بناکر بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے -جس نے ہر شوہر یعنی ہر نسل کی یادگاروں کو بڑی محبت سے گلے لگایا ہے مگر اپنی انفرادیت کو بھی کھونے نہیں دیا —— افسانہ علامتی ہونے کے باوجود قریب از فہم ہے اور زبان کی سادگی کی وجہ سے دلکش بھی ——————

ان تمام افسانوں کے جائزہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی تک انکے افسانے ناکامی اور کامیابی کے دو راہے سے گزر رہے ہیں -

—— xxx ——

۱-دودھ -رام لعل (چراغوں کا سفر) ص ۱۲۸

غیاث احمد گدی :-

غیاث احمد گدی کے افسانوں میں کردار کی نفسیات بڑی خوبی سے پیش کی جاتی ہیں - انکے افسانوں کے کردار جو اسی سماج کے رہنے والے ہیں - سماج کے بنائے ہوئے اصولوں سے اپنے آپکو آزاد کرنا چاہتے ہیں ۔ سیدھی سادی نارمل زندگی اپنانے میں انہیں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور وہ ان دشواریوں سے ہار کر کوئی ایسی زندگی اپناتے ہیں جسے سماج قبول نہیں کرتا ۔ گدی کے کردار زندگی کی جدو جہد میں سر گرداں نہیں ہوتے - وہ تھک ہار کر غیر سماجی زندگی پر آمادہ ہوجاتے ہیں ۔ اسکی مختلف وجوہات ہوتی ہیں کبھی وہ معاشی حالات کے آگے کمزور پڑ جاتے ہیں اور کبھی خاندانی زندگی فرد کو ذہنی کشمکش میں مبتلا کردیتی ہے ــــــــ افسانوں کے کردار کسی نہ کسی الجھن اور ذہنی کرب میں مبتلا نظر آتے ہیں - افسانہ نگار کی کامیابی یہ ہے کہ وہ کردار کے ذہنی الجھاؤ کوبڑی خوبصورتی سے پیش کرتا ہے ۔ کبھی کبھی کردار کی نفسیات ریشم کی گانٹھ کی طرح قاری کے ذہن پر کھلتی چلی جاتی ہے اور کبھی کبھی یہ گانٹھ اتنی مضبوط ہوجاتی ہے کہ پڑھنے والا اسکی زندگی کی کڑیوں کو جوڑنے سے قاصر رہتا ہے اور نتیجہ کے طور پر افسانے کا مجموعی تاثر پھیکا پڑنے لگتا ہے ۔ ــــــــــــــــ

کردار کی نفسیات کی عکاسی کے علاوہ دوسری خوبی غیاث احمد گدی کے یہاں افسانے کی زبان ہے جو نہ تو اتنی کھردری ہے کہ افسانے کی دلچسپی ختم کردے اور نہ اتنی شاعرانہ ہے کہ کہانی میں بار لگے ــــــ اکثر کردار کی نفسیات کی عکاسی

کے لئے وہ پرندوں کا سہارا لیتے ہیں ! انسان کے اندر کے وحشی پن کو اجاگر کرنے کے لئے علامتیہ سانپ کا ذکر کرتے ہیں اور بارش کا ذکر بھی جنسی جذبات کو ابھارتا ہے اور کبھی دل کے حبس اور گھٹن کو دور کرتا ہے ! ——————

یہ مذکورہ علامتیں ان کے افسانوں میں عام طور پر پائی جاتی ہے ——— یہ تکنیک زبان کے علاوہ تیسری خوبی گدی کے افسانوں کی تکنک ہے یہ تکنیک افسانہ کی کامیابی کے لئے بڑی حد تک ذمہ دار ہوتی ہے ۔گدی کے افسانوں میں زیادہ تر وہ تکنیک ملتی ہے جس میں واقعات کی کڑیوں کے سہارے افسانہ آگے بڑھتا ہے اور زیادہ تر گہری اداسی پر ختم ہوجاتا ہے ! اکثر کہانی ایک کردار کی زبانی بیان کی جاتی ہے کہانی کے دوسرے کردار بھی سامنے آتے جاتے ہیں مگر انکی زندگیاں افسانہ بیان کرنے والا اجاگر کرتا ہے ! افسانے کے پس منظر سے مرکزی کردار ابھرتا ہے اور آہستہ آہستہ تمام واقعات سامنے آتے جاتے ہیں ——— اس سلسلے میں جوہی کا پورا اور چاند " افسانہ قابل ذکر ہے اس میں ننھی کی زبانی دیدی کی کہانی سنائی گئی ہے حال اور ماضی کو ہندو دیو مالا اور فطری مناظر کے ذریعہ اجاگر کیا گیا ہے ایک بہن اپنے تاثرات کی روشنی میں دیدی کی زندگی کی کڑیاں جوڑنے کی کوشش کرتی ہے ۔اور "دیدی" کی زندگی کی محرومیاں اسکی اندرونی کشمکش بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کی گئی ہے ۔چھوٹی چھوٹی باتوں سے دیدی کی نفسیات کی عکاسی کی گئی ہے ——————

یہ وہ کردار ہے جو اپنے گھر آئے ہوئے مہمان عاشق کی امانت کو وہ کسی سفید مسجد والے گاؤں میں کھو آئی ہے جسکی وجہ سے وہ ان جوہی کے پودوں کی طرح جھلسی جارہی ہے جنھیں پانی نہیں مل رہا ہے یہ مہمان عاشق سب کچھ جان کر بھی بجھے

ہوئے اس چراغ کو پھر سے جلانا چاہتا ہے ۔گھر کے تمام افراد کے چہرے خوشی سے کھل جاتے ہیں ـــــ مگر اچانک مکھیا ماجن کا واقعہ دیدی کے کردار کو پل بھر میں بدل دیتا ہے اور وشادی کا جوڑا پہننے کے بجائے محسوس کرتی ہے کہ سفید مسجد والے گاؤں میں کوئی جوہی کا پودا رہ گیا ہے جسکی یاد نے اسے جھنجھوڑ دیا ـــــ دیدی کے کردار کی ذہنی و جذباتی الجھنوں کو افسانہ نگار نے چھوٹی چھوٹی باتوں سے ظاہر کیا ہے لیکن اس کا رشتہ سفید مسجد والے گاؤں سے کیا ہے ؟ مہمان عاشق کی امانت کس کے ہاتھوں چھن گئی ؟ ان سوالوں کے جواب افسانہ نگار نے اجاگر نہیں کئے ہیں ! ایک جگہ نتھی سوچتی ہے دیدی سچ کہتی ہے :ـــــ

"کبھی کانٹوں کی باڑھ میں زندہ رہنے کو جی چاہتا ہے اور کبھی پھولوں کے بستر پر بھی من زندگی کو تیاگنے کو بے قرار رہتا ہے ۔ یہ سمئے سمئے اور جگہ جگہ کی بات ہے ـــ" ۱۔

دیدی کا کردار کانٹوں کی باڑھ میں زندہ رہنے کو ترجیح دیتا ہے ! کیونکہ سفید مسجد والے گاؤں میں کسی جوہی کے پودے کی یاد پل بھر کے لئے بھی اس کا دامن نہیں چھوڑتی ـــــ اور اس طرح دیدی کی زندگی وقت کے سود خوروں کے آگے ایک دم زرد پڑ جاتی ہے ! ـــــ ساری کہانی ایک گہری اداسی پر ختم ہوجاتی ہے ! اور دیدی کی نفسیات کو سمجھنے کے لئے قاری اسکی زندگی کے عمیق خلأ کے بارے میں سوچتا رہتا ہے جسے افسانہ نگار نے واضح طور پر نہیں

۱۔ بابا لوگ ۔ غیاث احمد گدی ۔ص ۲۱۱ ، ۱۹۶۹ء

پنایا ہے ! کردار کی نفسیات اس کا فلسفئہ زندگی کھل کر سامنے آیا ہے ——
اس افسانے کے علاوہ گدی نے اکثر افسانوں میں عیشا ئی زندگی انکے ماحول اور ذاتی زندگی کی دشواریوں کو اپنا موضوع بنایا ہے ! ایک لڑکی اپنی معاشی بدحالی کے آگے کس طرح نہ چاہتے ہوئے روپیہ کی خاطر دوسروں کی زندگیوں میں داخل ہوئی ہے اور انکے دکھ درد میں شریک ہوتی ہے ——جنھیں سماج کال گرل کے نام سے جانتا ہے یہ لڑکیاں کیا واقعی اپنے دل اپنے جذبات بیچ دیتی ہیں کیا انکی زندگی صرف پیسہ کو حاصل زندگی سمجھتی ہے ! ایسی لڑکیاں جنھیں سماج بہ آسانی اپنی حدود سے باہر نکال دیتا ہے انکی اندرونی زندگی کو غیاث احمد گدی نے اپنے افسانوں میں پیش کیا ! ایسے کردار اس سے پہلے منٹو اور دوسرے افسانہ نگاروں کے یہاں بھی پائے گئے جو آزادی کے بعد سماجی تبدیلی کے ساتھ ساتھ سامنے آگئے ! اس سے پہلے اس طرح کے کردار طوائف کی شکل میں سامنے آئے تھے —— کال گرل طوائف سے کسی قدر مختلف شکل ہے انکا ماحول بھی طوائف سے الگ ہے —— دونوں کی زندگی کا مقصد تقریباً ایک ہے غیر مردوں کو وقتی خوشی دینا اور ان سے روپیہ حاصل کرنا ——غیاث احمد گدیؔ نے اپنے ایک افسانے " پیاسی چڑیا " میں للیؔ واٹسن کے کردار میں ایسی بھی زندگی پیش کی ہے ! للی واٹسن کا رشتہ بڑے بڑے سیٹھ اور پیسہ والوں سے ہوتا ہے ! ایسا لگتا ہے جیسے اس کردار کی زندگی اپنی ماں کے ہاتھوں کے آگے ایسی زندگی اپنانے پر مجبور تھے ۔اس کے دل میں شرافت اور سماجی زندگی کی خواہش ایک تشنگی بن کر رہ جاتی ہے ! دوسری طرف ماں کے کردار سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس ماحول میں اس طرح رچ بس گئی ہے کہ اس سے باہر نکلنے کی کوئی خواہش اسکے دل میں نہیں ہوتی ——للیؔ واٹسن کو

سیٹھوں اور مالداروں کی چمک دار دنیا کے علاوہ ایک بار ایک ڈرایور کی زندگی دیکھنے کا اشتیاق ہوتا ہے ـــــ اچانک ایک دن وہ سیٹھ کے یہاں جانے کے بجائے ڈرایور سے کہتی ہے ـــ "آج ہم تمہارے گھر جائے گا" ـــــ جس پر ڈرائیور لرزتی ہوئی آواز میں جواب دیتا ہے ـــ " مگر ہمارے پاس پیسہ نہیں ہے !! ـــــــــ زندگی میں پہلی بار للّی واٹسن کا ذہن سوچتا ہے سچائی جو کچھ دکھائی دیتی ہے ویسی نہیں ہے بلکہ اس سچائی کے نیچے ایک حقیقت ہے جو بڑی کھردری ہے ـــــ وہ ڈرایور کے ساتھ اسکے گھر جانے پر آمادہ ہوجاتی ہے اور یہاں سے اس کردار کی انسان دوستی کھل کر سامنے آتی ہے وہ ایک ایسے ماحول میں تین دن گزار دیتی ہے جہاں تنگ تاریک کمرے میں اسے ان دیکھی دنیا ملتی ہے ـــــــــ انجانا ماحول ملتا ہے ـــ ایک پیاسی دم توڑتی ہوئی بیوی زندگی کے آخری لمحے پورے کر رہی ہوتی ہے اور بچے مفلسی و بدحالی کی زندہ تصویر بنے ہوتے ہیں ۔ للّی واٹسن ڈرایور کی بیوی کی پیاسی حلق میں پانی پہنچاتی ہے اور اس طرح وہ نڈھال عورت اپنی زندگی کے بارے میں بتاتی ہے ـــــــــ

" میں کئی مہینوں سے بیمار ہوں اور اسی حالت میں
اپنا جسم نچواتی ہوں ـــــ میرا شوہر مجھے کھانے کو دیتا
ہے ۔ کپڑے دیتا ہے اور سود خور بنئے کی طرح اسکی قیمت
وصول کرنے میں ذرا دریغ نہیں کرتا میں لاکھ کہتی ہوں
میرے بدن میں میرے جوڑ جوڑ میں درد ہے میرا دل رہ
رہ کر ڈوبنے لگتا ہے مگر وہ نہیں مانتا اسکی آنکھیں اس
وقت اور بھی سرخ ہو اٹھتی ہیں ـــــــــ

——اور اس وقت میں سوچتی ہوں کہ دام تو ہر خریدار
کو وصول کرنے کا حق ہے اور یہ سوچکر چپ ہوجاتی ہوں اور
بعد ازاں کھرّی چارپائی پر نڈھال ہوکر گرجاتی ہوں جیسے
کسی کبوتری کو بڑی زور کا غلیل کا ڈھیلا لگا ہو اور ویران
دھرتی پر پیاسا ہانپ رہا ہو ——ہانپے جا رہا ہو ——" ! !۱ـ

بیوی کی ان باتوں سے اندازہ ہوتا ہے جیسے للّی واشن کی طرح اسکی زندگی بھی پیاسی ہے اور مرد اپنی جنسی بھوک کے آگے کتنا وحشی ہوجاتا ہے پھر للی واشن کی سچی باتوں کو سنکر کسی طرح وہ یقین نہیں کرسکتی کہ دوسروں کی پیاس بجھانے والا انسان دوستی کا یہ پیکر خود کتنا پیاسا ہے ! تین دن تک لگاتار وہ اس ماحول میں رہتی ہے ـ ڈرائیور کی بیوی کی خدمت کرتی ہے مگر وہ آخر کار دم توڑ دیتی ہے ـ بچوں کی بھی حالت سدھارتی ہے لیکن پھر اسے اپنی پیاس کا احساس ہوتا ہے ! اس کمرے میں وہ گھٹن محسوس کرتی ہے پیاس بجھانے کے لئے وہ چلتے چلتے تھک جاتی ہے ——میونسپلٹی کا نل دیکھ کر وہ سوچتی ہے خوب جی بھر کے پانی پئے جاتی ہے ~~کا~~ مگر وہاں ایک کتے کا پلہ اپنی پیاس بجھا رہا ہوتا ہے للی واشن کو یہ دیکھ کر ایسا لگا جیسے پلے کی حلق قطروں کی شکل میں موتی بھنچ رہے ہوں اور وہ اپنی پیاس بھول جاتی ہے — —— انسان دوستی جیسے موضوع کو بیان کرنے کے لئے غیاث احمد گدی نے للی واشن کا کردار بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے ـ تمام حالات کردار کی زبانی اس طرح بیان کئے گئے ہیں جس سے کردار کی اپنی نفسیات بھی اجاگر ہوتی رہی ہیں —— ! !

۱ـ بابا لوگ ـ غیاث احمد گدی ـ ص ۱۸۲

حالات ، ماحول بڑی حد تک انسانی شخصیت کے ذمہ دار ہیں ۔انسان کے بننے بگڑنے میں بھی انکا بہت اہم رول ہے مگر ایسا نہیں کہ اپنے ماحول اور حالات کے سامنے شخصیت کا کچھ بس نہ چلے ۔اگر اقتصادی پریشانیوں کی بنا پر ایک شخص چوری موت اور دوسری غیر سماجی حرکتوں پر آمادہ ہوتا ہے ۔عورت جسم فروشی کا راستہ اختیار کرتی ہے تو ایسی ماحول میں رہکر کچھ لوگ اپنے ماحول کو یکسر بدل بھی دیا کرتے ہیں ـــــ عورت ہمیشہ حالات سے مجبور ہوکر جسم فروشی پر آمادہ نہیں ہوتی ـــــــحق و باطل کی جنگ میں کبھی کبھی حق کو بھی فتح حاصل ہوتی ہے ! اس موضوع کو غیاث احمد گدی نے اپنے افسانے " ڈور تھی جون سین " میں بڑے سلیقہ سے واضح کیا ہے ـــ اس افسانے میں ایک ایسی کرسچن عورت کے کردار کو پیش کیا گیا ہے جو مسلسل شوہر کی بیماری کی وجہ سے اقتصادی پریشانیوں کی وجہ سے اپنے زیور بیچنے ایک جیولوز کے پاس جاتی ہے جو جوان لڑکیوں کو گمراہ کرتا ہے وہ ڈوڑ تھی جون سین سے بھی کہتا ہے :-

" اگر زیور نہ بھی ہو تو کوئی حرج نہیں میڈم -----

---------- صرف آپ کا ہونا کافی ہے ـــــــ" ۔۱۔

ڈور تھی کو یہ الفاظ گالی کی طرح گراں گزرتے ہیں ۔وہ ہر طرح سے اپنے شوہر کو موت کے منہ سے بچانا چاہتی ہے مگر مالی حالات اسکی مدد نہیں کرتے اسکے ذہن میں جیولو کے الفاظ گونجے اور برائی کے راستہ پر جانے میں اسے عافیت نظر آئی ۔بیمار شوہر کے پوچھنے پر کہ وہ کہاں جارہی ہے ـــ کہتی ہے ـــــ

" پڑوس والی مسلمان عورت کہتی ہے کہ جنت میں پھول

۱۔ بابا لوگ ۔ غیاث احمد گدی ۔ ص ۱۳۵

ہوتے ہیں اور جہنم میں آگ ۔میں آج جہنم جارہی ہوں۔
جہنم سے روشنی لانے ———" ۲۔

اور وہ گھر سے نکل جاتی ہے ۔یہاں تک قاری یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے حالات سے ہار کر یہ بھی گمراہی کے اندھیروں میں اپنے آپکو ڈھکیل دیگی ۔مگر اچانک اسکے سامنے گرجا کی عمارت آگئی ۔یسوع مسیح کے مجسمہ پر نظر پڑتے ہی اسکا جی چاہا کہ اس پر گر کر وہ یہیں روتی رہے ۔مگر وہ آگے بڑھ گئی لیکن اسکے کانوں میں یسوع کی آوازیں جاتی رہیں ———لڑکی اٹھ ———اس پستی سے اٹھ ! ! اور اچانک اسکے اس نے اپنا رخ موڑ دیا وہ مقدس روشنی لئے اپنے گھر واپس آتی ہے لیکن اسکا شوہر ابدی نیند سوچکا ہوتا ہے ا ڈور تھی کے کردار کی مشابہت بحدی دکھانے کے لئے افسانہ نگار نے شیلےکا یہ نغمہ اس سوگوار فضا میں گونجتا ہوا پیش کیا ہے ———

" گلاب کی پتیاں
جب گلاب بکھر جاتا ہے ۔محبوب کی سیج پر بکھیر دی
جاتی ہیں اس طرح ۔ تیرے خیال پر جب تو میرے پاس
نہیں ہوتا خود عشق آرام کرتا ہے "۔ ۲۔

ایک عورت تنہاں کس طرح اپنے حلات کا مقابلہ کرتی ہے اور برائی کے راستہ پر پہنچکر وہ کس طرح سچائی کے راستہ پر واپس آتی ہے اس موضوع کو غیاث احمد گدی نے بڑی خوبی سے پیش کیا ہے ا ———

۱۔ بابا لوگ ۔غیاث احمد گدی ۔ ص ۱۵
۲۔ بابا لوگ ۔غیاث احمد گدی ۔ص ۱۵۲

جنس ایک ایسا موضوع ہے جس پر افسانہ نگار نے اپنے انداز سے افسانے لکھے ہیں - کہیں پر یہ موضوع معاشرہ کی برائیوں کے پس منظر میں ابھرا ہے اور کبھی اقتصادی پریشانیوں نے اسے بے نقاب کیا ہے اور کبھی محض حالات کے زیر اثر یہ جذبہ ابھرا ہے ـــــ غیاث احمد گدی کے یہاں یہ جذبہ ایک سانپ کی شکل میں انسان کے اندر پایا جاتا ہے یہ سانپ ڈستے وقت کسی سماج مذہب اور رشتہ کا خیال نہیں رکھتا ـــــ یہ جنسی جذبہ ایسی صورت میں کردار کے اندر ابھرتا ہے جس پر اسکا کوئی اختیار نہیں ہوتا ـــــ یقیناً اس جذبہ پر اختیار نہ ہونے کی وجہ شخصیت کی کمزوری ہے مگر گدی کے افسانے " افعی " میں اس جذبہ کو اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ قاری متحیر رہ جاتا ہے ط اس افسانے کا مرکزی کردار " زہرہ " ہے - اسکی ماضی کی تلخ یادوں کے پس منظر میں کہانی ابھرتی ہے ـــــ زہرہ ایک شادی شدہ عورت ہے مگر حالات اسے اس طرح مردہ کر دیتے ہیں کہ وہ ایک درباں کے ساتھ سونے میں بھی ہچکچاہٹ نہیں محسوس کرتی ـــــ اچانک ایک دن اسے ایک نوجوان کپڑے کی دوکان پر ملتا ہے اور وقت ان دونوں کو ایک دوست کی شکل میں یکجا کر دیتا ہے - زندگی کے تمام حالات اسی دوست کے سامنے دہرائے جاتے ہیں ـــــ یہ دو کردار کافی وقت ایک ساتھ گزارتے ہیں جس میں انگنت بار دونوں جذباتی طور پر ایک ہونے لگتے ہیں مگر جیسے زہرہ کا کوئی زخم کھٹکنے لگتا ہے اور وہ اپنا ماضی یاد کرنے لگتی ہے ـــــ تیز بارش دیکھ کر اسے ایام گذشتہ کی ایک ایسی ہی بارش یاد آنے لگتی ہے ـــــ تیز بارش اور وہ اپنے دوست کو بتانے لگتی ہے ـــــ ایسے ہی ماحول میں ایک بار اس کے بلاؤز کا بٹن ٹوٹ گیا تھا اور وہ زور زور سے پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے لگا تھا یہ کردار کوئی اور نہیں بلکہ زہرہ کا سگا چھوٹا بھائی تھا ـــــ ان دونوں کا جنسی تعلق مختلف شکلوں میں افسانے میں اس طرح پیش کیا گیا ہے جسکے لئے نہ کسی کو قصور وار

ٹھرایا جاسکتا ہے اور نہ ہی کسی سے ہمدردی کی جاسکتی ہے زہرہ کا بھائی صرف جنسی چھیڑ چھاڑ کے ساتھ سامنے آیا ہے اور ایک دن یہی جنسی جذبہ ایک زہریلے سانپ کی شکل اختیار کرلیتا ہے جو نہ صرف زہرہ کو ڈس لیتا ہے بلکہ خود اپنے ہاتھوں اپنی زندگی ختم کرلیتا ہے ـــــ یہ حادثہ بھی زہرہ اپنی زبان سے دہراتی ہے ـــــ زہرہ غسل خانے میں ننگی نہا رہی ہوتی ہے کہ انور دروازہ کھولتا ہے اور زہرہ سے لپٹ جاتا ہے اور پھر سب کچھ ہوجاتا ہے ـــــ اور انور ماں کی چیخ اور اسکی مار سے جیسے جاگ جاتا ہے اور چیختا روتا ہوا وہ گھر سے باہر نکل جاتا ہے ۔اسی شام کو ریلوے لائن پر اسکی لاش پائی جاتی ہے!! یہاں پر جیسے افسانے کا ایک حصہ ختم ہوجاتا ہے ـــــ افسانہ اور آگے بڑھتا ہے ۔ان لمحوں کو فراموش کرنے کے لئے زہرہ شراب کا سہارا لیتی ہے اور کچھ دیر کے لئے غافل ہوجاتی ہے ۔ نوجوان جو کہ مرکزی کردار کے ساتھ ساتھ رہا ہے اور تمام واقعات اسی کے سامنے دہرائے گئے ہیں وہ زہرہ کو اپنے سامنے لیٹا دیکھتا ہے ـــــ پیگ دینے کے لئے اسکے قریب جاتا ہے اور زہرہ کے چہرہ پر جھک جاتا ہے ـــــ اور پھر اس کے اندر بھی جنسی جذبہ غالب ہونے لگتا ہے مگر زہرہ کے تنفس کا الجھاؤ یہیں پر ختم ہوجاتا ہے اور وہ نوجوان کے چہرہ پر ایک تھپڑ مار کر الگ ہوجاتی ہے ـــــ افسانہ یہیں پر ختم ہوجاتا ہے ـــــ

زہرہ اور انور دونوں کی شخصیتوں کا اگر جائزہ لیا جائے تو سب سے پہلے ذہن انور کے جنسی وحشی پن کی طرف جاتا ہے ! زہرہ جو اپنے اکلوتے چھوٹے بھائی کو جی جان سے چاہتی ہے ذرا دیر بھی اس سے الگ نہیں رہ سکتی ۔وہ انور کی شخصی تبدیلی سے خود متحیر ہوتی ہے ۔وہ خود ایک مہذب سنجیدہ لڑکی تھی ! سیدھے سادے بھائی کے بارے میں بتاتی ہے کہ انور ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا ۔بلکہ

کالج جانے کے بعد اسکی ذات میں تبدیلیاں آئیں — اور ان تبدیلیوں کو اس اقتباس کی روشنی میں اچھی طرح دیکھا جاسکتا ہے ۱ —————— اس کی شخصیت کو سمجھنے کے لئے زہرہ کے یہ جملے بہت اہم ہیں ———

" انور بڑا شریر تھا - چلبلا ، تیز ، شوخ ——— سدا سے ایسا نہیں تھا - کالج جانے کے بعد اس پر یہ رنگ چڑھا تھا - اس سے پہلے تو بڑا سیدھا سادھا بیوقوف سا تھا ——— مگر بعد میں وہ کالج میں ایک دم سے بدل گیا - اسکی سادہ سادہ آنکھوں میں ایک عجیب طرح کی خون آمیز چمک آگئی — جب بھی میں بھول سے اسکو کان پکڑنے کو کہتی تو وہ اوندھا ہوکر مجھ پر گر پڑتا اور میرے کان بلکہ میرے گالوں کو اتنی زور سے مسل دیتا کہ میں رو پڑتی وہ لپک کر میرے قریب آ جاتا اور اپنی کانپتی ہوئی انگلیوں سے میرے گال سہلانے لگتا اس وقت اس کے سارے جسم میں ہلکا ہلکا لرزہ طاری ہوجاتا - سانس لمبی لمبی چلنے لگتی چہرہ سرخ ہوجاتا اور آنکھیں یوں دیکھنے لگتیں گویا چوری کر رہا ہو - پھر میں جب اس کا ہاتھ جھٹک دیتی اور ایک طرف ہوجاتی تو وہ صوفے پر دھپ سے گرجاتا اور یوں ہانپنے لگتا گویا کسی نے اسے سرپٹ دوڑایا ہوا - "

———————

۱- پرندہ پکڑنے والی گاڑی — غیاث احمد گدی - ص ۱۱۰ - ۱۹۷۷ء

انسان کی شخصیت بنانے میں پہلا ہاتھ اسکے والدین اور ابتدائی گھریلو ماحول کا ہے -اس مذکورہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوگیا کہ انور پہلے ایسا نہ تھا - ـــــ کالج جاکر وہ ایک دم بدل گیا اس کے لئے پورے طور پر کالج کا ماحول -ساتھیوں کا اثر ذمہ دار ہے ! ـــــ کالج جانے کے بعد بھی وہ گھر میں زہرہ سے جنسی چھیڑ چھاڑ شروع کردیتا ہے ـــــ ایسا کرنے میں زہرہ سے جنسی زہرہ خود کسی طرح کی لذت محسوس کرتی ہمیشہ اسکو انور کی یہ حرکتیں عجیب اور عجیب سی لگتی ہیں مگر پھر بھی زہرہ کی طرف سے کسی خفگی اور سختی کا رد عمل نہیں ہوتا ـــــ ایک دن اچانک ڈاکٹر کے پاس جاتے جاتے انور کے اندر کا سانپ رینگنے لگتا ہے اور وہ زہرہ کے ساتھ گلیوں میں تیز تیز چلتے چلتے اچانک اپنے پیر کی آڑ لگاکر گرانا چاہتا ہے اور جیسے ہی زہرہ گرنے لگتی ہے انور اسکو اپنی آغوش میں بھرلیتا ہے ! ـــــ جب بھی انور کی شخصیت کے اندر کا یہ سانپ ظاہر ہوا ہے -انور وحشی کے روپ میں سامنے آیا ہے اور یہ وحشت اتنی بڑھتی ہے کہ ایک دن وہ سب کچھ ہوجاتا ہے جسکے بعد خود اسکا جینا مشکل ہوجاتا ہے ! ـــــ انور اور زہرہ کے درمیان غسل خانہ میں جس جنسی وحشت کا بیان کیا گیا ہے -اس کے بعد ذہن سوچتا ہے کہ کیا انور نے سب کچھ ہوش میں کیا جس کا جواب زہرہ خود دیتی ہے:ـــــ

" ماں کہتی تھیں -جب وہ دروازہ کھول کر باہر نکلا -اس وقت بھی اسکی آنکھیں کبوتر کی آنکھوں کی طرح سرخ تھیں اور جسم کی ہوش ہوش کانپ رہی تھی دروازہ کھول کر جیسے ہی وہ باہر نکلا اماں نے چیخ کر اس کا نام لیکر پکارا اور توا اٹھاکر زور سے اسکے سر پر دے مارا ـــــ کہتے ہیں چوٹ

پڑتے ہی انو گویا جاگ گیا اس وقت وہ اتنی زور سے
" زہرہ آیا " کہ کر چلایا کہ خیال گزرتا تھا کہ اسکی
ساری قوت آواز کے راستہ پھٹ پڑی ہو ـــــ پھر وہ اپنے چہرہ
کو اپنے دونوں ہاتھوں سے چھپاکر بھاگتا ہوا ـــ روتا ہوا
باہر نکل گیا ـــــ" ۱۔

اس اقتباس کی روشنی میں انور نے جو کچھ کیا وہ مدہوشی میں یعنی اس پر جنسی جذبہ اسقدر حاوی ہوگیا تھا کہ بالکل مدہوش تھا رشتوں سے بے خبر تھا اور سب کچھ کرنے کے بعد بھی وہ اسکی آنکھوں سے وحشت دور نہیں ہوئی تھی مگر ماں کی آواز اور اسکی مار کی چوٹ سے وہ بیدار ہوا اور پھر اس طرح شرمندہ ہوا اور اس طرح ان حرکتوں سے پریشان ہوا کہ اسے موت کے سوا کہیں ٹھکانہ نہیں ملا ـــــــ دوسری طرف زہرہ کا کردار جو اپنی آنکھوں کے سامنے جنسی سانپ کو اتنے بھیانک روپ میں دیکھتی ہے وہ بھائی کی موت کے بعد اس طرح اسے ساتھی بنالیتی ہے گویا اب اسکا زہر اس پر اثر نہیں کرتا ـــــ وہ دربان ۔تانگہ والا پر ایک کے ساتھ رات بسر کرتی ہے اور اپنی ساری زندگی ایسے ہی نہ جانے کتنے سانپوں کے درمیان گزارتی ہے ـــــــ لیکن ایک نوجوان جسے اپنے دکھ درد کا ساتھی بناتی ہے اسکی آنکھوں میں اکثر اسے انور کا عکس نظر آتا ہے جس سے وہ نفرت نہیں کرتی ! اور کسی طرح اس سے جنسی تعلق پیدا نہیں کرپاتی ـــــــــــ ! ! زہرہ کی بے مقصد زندگی کا دارو مدار اسکی پرانی تلخ یادوں سے ہوتا ہے ۔ان لمحوں کو فراموش کرنے کے لئے وہ برانڈی کا سہارا لیتی ہے ـــ اس کے دل میں اب بھی بھائی کے لئے وہی محبت

۱۔ پرندہ پکڑنے والی گاڑی ۔غیاث احمد گدی ۔ص ۱۱۹

ہے وہ یہ بھی سوچتی ہے اگر اسے معلوم ہوتا وہ پھر کبھی واپس نہ آئے گا تو اسے روک لیتی اور اگر کہیں سے وہ آجائے تو وہ یہ مٹی کا جسم اسکے قدموں پر ڈال دے —— اس افسانے کو زہرہ کے کردار کے ذریعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے اور اسمیں ایسی زبان کا استعمال ہوا ہے جس سے پڑھنے والا انور اور زہرہ کی جنسی نفسیات کی کمزوریوں کو بخوبی دیکھ لیتا ہے ! ——

غیاث احمد گدی نے جو موضوع لیا ہے اس میں ماحول اور کردار کی عکاسی بڑی خوبصورتی کے ساتھ کی ہے - ایک نوجوان تعلیم کے بعد نوکری حاصل کرنے کے لئے کن کن دشواریوں کا سامنا کرتا ہے اور ان دشواریوں میں اسے کس ذہنی کرب سے گزرنا پڑتا ہے اسکا اندازہ دوسرے لوگ نہیں لگاسکتے یہاں تک اپنے ہی گھر کے لوگ اسکی نفسیات کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں ! تبھی تو کوئی اس نوجوان کی پریشانی اور خاموشی کو اندھے اعتقاد کی لپیٹ میں لیکر کہدیتا ہے اس پر کالے شاہ کا سایہ ہے ! بھائی بھابی یہاں تک ماں بھی اسکی الجھنوں کو سمجھ نہیں سکتی ! —— نوکری اس مسئلہ کو مختلف انداز سے ادیبوں نے قلم بند کیا ہے لیکن بیکاری کی اندرونی گھٹن کو غیاث احمد گدی نے بڑی خوبی کے ساتھ افسانہ "کالے شاہ" میں پیش کیا ہے ! ماحول اور کردار کے ساتھ افسانے کی دوسری جزوی باتوں کا خاص خیال رکھا ہے ! —— افسانے کا تسلسل کہیں پر نہیں ٹوٹتا ہے —— اس افسانے میں بھی ایک چھوٹی بہن نے تمام افسانہ بیان کیا ہے ! مجو بھیا کا کردار نوکری کی تلاش کرتے کرتے تھک جاتا ہے ! ناکامی و مایوسی اسکی شخصیت میں زبردست تبدیلی لاتی ہے وہ اب سماج اور خود اپنے ماحول سے کٹ جاتا ہے !! ہر طرح

کوشش کرتا ہے مگر کہیں سے کوئی امید نہیں پڑتی ——— دوسری طرف اس افسانے میں اس کردار کی تبدیلی میں گھر کے ماحول کا بھی دخل بتایا گیا ہے - بھابھی بھائی کا برا سلوک ماں کی طنزیہ باتیں اس کردار کی ذہنی الجھنوں میں اور اضافہ کرتی ہیں اور وہ بالکل ساکت و جامد ہوکر رہ جاتا ہے ! ایسی حالت میں جب بھی اس کے چہرہ پر رونق دیکھی گئی اسکی وجہ نوکری کی خوش خبری ہوئی لیکن ہر بار یہ رونق اداسی میں بدل جاتی جب بھی وہ گھبرایا گھر کے قریب کالے شاہ کے مزار پر چلاجاتا ——— اور لوگوں کا کہنا تھا مجو بھیا کی یہ حالت کالے شاہ نے بنائی تھی جو ایک سایہ کی طرح ان لپٹ گیا ہے ——— مجو بھیا پر جیسے دورہ پڑتا اور وہ دیوانے ہوجاتے پھر سنبھلتے اور نوکری کی فکر کرتے مگر :—

" نوکری کہاں ملتی وہ تو کہانیوں والی سبز پری بن گئی تھی کہ مجو بھائی جس قدر اسکی تلاش کرتے اتنا ہی وہ ان سے الگ تھلگ چھپی رہتی —"[1]

اور یہ نوکری اسوقت ملتی ہے جب خود ان میں کمی نکل آتی ہے - منتخب ہونے کے بعد انکا میڈیکل ٹیسٹ ہوا اور اسمیں ان فٹ کردئے گئے ——— انکا دماغ پھیپھڑے میں خرابی شروع ہوگئی ہوتی ہے ——— اس کے بعد مجو بھیا کی بہن کی شادی - روپیہ کی تنگی بھائی بھاوج کی خود غرضی اور پھر مجو بھیا کا باغی ہونا ——— ان تمام جزوی باتوں کو افسانہ نگار نے بڑے فطری انداز میں پیش کیا ہے - بغاوت کے بعد مجو بھیا اور بڑے بھائی میں لڑائی ہوتی ہے اور مجو بھیا کو گھر سے الگ کردیا جاتا ہے —

۱- پرندہ پکڑنے والی گاڑی - غیاث احمد گدی - ص ۱۱۹

اب یہ کردار پر طرف سے ہار چکا ہوتا ہے یہ تھکا ہارا کالے شاہ کے مزار کے پاس جاتا ہے اور جب گھر والے ڈھونڈتے ڈھنڈتے اس وقتک پہنچتے ہیں وہ زندگی کی پریشانیوں اور دنیا کی خود غرضیوں سے نجات پا رہا ہوتا ہے ۔ آخری وقت وہ کہنا ہے اب کالے شاہ کا سایہ کبھی نہ آئے گا ——— مگر افسانہ بیان کرنے والا کہتا ہے ——— لیکن یہ سایہ تو پیچھا بھی نہیں چھوڑتا ——— بلکہ روز بروز ——— یہی افسانہ کا اختتام ہے ——— بیکاری کے بعد انسان کی ذہنی پریشانی اور اس پریشانی کے نتائج ہی اس افسانہ کا مرکز ہے اس کے علاوہ بھی افسانہ نگار نے کچھ اور خیالات کو اجاگر کیا ہے ۔ مثلاً لوگوں کے اندھے عقیدہ ——— مجو بھیا جب نارمل موڈ میں رہتے لوگ انکو برا بھلا کہتے ——— انکو روپیوں پیسوں کی ضرورت ہوتی کوئی انکے کام نہ آتا لیکن جب بھی ذہنی کشمکش آتی انہیں ایب نارمل بنا دیتی لوگ ہر طرح ان پر خرچ کرنے کے لئے تیار ہوجاتے جیسا کہ ایک جگہ بیان کرنے والا کہتا ہے :———

" جس دن ایسا ہوتا یعنی کالے شاہ کا سایہ مجو بھائی پر آتا بڑے بھیا خصوصاً بھابھی بڑی سہمی سہمی رہتیں اور رات کے کھانے کے وقت کوئی نہ کوئی اچھی چیز ضرور بنا لاتیں اور بڑے پیار سے پنکھا جھل جھل کر مجو بھائی کو کھلاتیں ——— " ۱۔

مجو بھیا کے کردار کی انفرادیت یہ ہے کہ ایسے نا خوشگوار حالات میں

۱۔ پرندہ پکڑنے والی گاڑی ۔ غیاث احمد گدی ۔ ص ۱۲۵ ۔ ۱۹۷۷ ۔ اسرار کریمی پریس ، الہ آباد

بھی وہ آخر وقت تک اپنی کوشش جاری رکھتے ہیں ۔ ہر طرف سے تکلیف و پریشانی کے سوا انہیں کچھ نہیں ملتا لیکن پھر بھی وہ سماجی زندگی اپنائے رہے ورنہ زیادہ تر دیکھا یہ جاتا ہے کہ حالات اور مشکلات سے تنگ آکر لوگ سماج سے اپنا رشتہ توڑ لیتے ہیں اور غیر سماجی حرکتوں پر آمادہ ہوجاتے ہیں مگر یہ کردار ایمانداری کی زندگی اپنانے کا آخر وقت تک خواہاں رہتا ہوتا ہے وہ اپنی ماں سے اپنی ایسی ہی خواہشات کا اظہار کرتا ہے ——

" نوکری ملتے ہی ایک گھر بنواؤں گا ۔چھوٹا سا صاف ستھرا اچھا سا پلنگ خریدوں گا ۔تمہیں بٹھاکر تمہاری بہو سے کہوں گا کہ اماں کی دن رات خدمت کیا کر ——"۱۔

یہ سچا ایماندار شخص آخر وقت تک ثابت قدم رہا ——————

گدی نے اس موضوع کو بڑے منفرد انداز میں پیش کیا ہے اس افسانہ کا کردار ناکام ہوجاتا ہے اور وہ خود اپنے سماج اسکے بنائے ہوئے قانون کو برا نہیں کہتا اس کے باوجود اسکی زندگی کی تباہی کا ذمہ دار سماج اور حکومت ہے ——ہندوستانی سماج میں بیکاری سے تنگ آکر کچھ لوگ قانون توڑ کر زندگی بسر کرتے ہیں اور کچھ مجو بھیا کی طرح اندر اندر گھل کر ختم ہوجایا کرتے ہیں ——

غیاث احمد گدی کے پاس افسانہ بیان کرنے کا بڑا دلکش انداز ہے افسانہ واقعات کی کڑیوں کے سہارے آگے بڑھتا ہے ان کڑیوں کا آپس میں جڑا رہنا ضروری نہیں۔ کبھی کبھی افسانے میں بہت ساری باتیں افسانہ نگار چھوڑجاتا ہے ——کردار کی زندگی میں آئے ہوئے واقعات وہ دہرادیتا ہے لیکن کردار کی نفسیاتی گرہ کھولنے کا کام وہ قاری پر چھوڑ دیتا ہے ——

——xxx——

واجدہ تبسّم :-

واجدہ تبسّم کا شمار اردو کی ان خواتین افسانہ نگاروں میں ہے جنھوں نے تقسیم ہند کے بعد افسانے لکھنا شروع کئے -۱- انکے افسانوں میں امن ، جنگ ہڑتال جیسے موضوعات کے بجائے وہ زندگی ہے جسے انھوں نے خود دیکھا سمجھا اور پرکھا ہے -اسسلسلے میں خود انکا بیان ہے :-

" ہزاروں موضوع اور مسائل ایسے ہیں جن پر لکھا جاسکتا ہے مگر میں یہ کہتی ہوں کہ اگر ہم گھر میں بیٹھ کر چولھا ہانڈی کرنے والی عورتیں ، جنھوں نے بازار کی شکل تک نہیں دیکھی یوں ایسی کہانیاں لکھنے لگیں -جن میں امن کا ذکر ہو - کسی جنگ کی تفصیل ہو یا کمیونزم یا کسی اور کا پروپوگنڈہ ہو تو کس قدر غلط سی بات ہوگی -" ۲-

گھروں میں رہنے والی ایک عورت کی حیثیت سے واجدہ نے جو کچھ گھروں میں دیکھا اسے اپنے افسانوں میں پیش کردیا -انکے ابتدائی مجموعہ شہر ممنوع کے افسانوں میں جاگیردارانہ تمدن کا زوال خاص طور پر نمایاں نظر آتا ہے -جنس کا موضوع بھی کسی نہ کسی شکل میں سامنے آتا رہا ہے -واجدہ تبسم نے مختلف

۱- شہر ممنوع - ۲۲ / ستمبر کو پہلی کہانی چھپی - ص ۲۶

۲- شہر ممنوع -واجدہ تبسم - ص ۲۲

موضوعات پر قلم اٹھایا ہے ۔دکنی زبان اور حیدرآبادی ماحول کی عکاسی میں یہ منفرد مقام رکھتی ہیں ۔حیدرآباد کے بڑے گھرانوں کی شان اور پھر آہستہ آہستہ انکے زوال پر افراد کی گرتی ہوئی مالی حالت انکے افسانوں میں جا بجا پائی جاتی ہے ۔ " گلستان سے قبرستان تک" افسانے میں اسی زوال کو موضوع بنایا گیا ہے ۔پر شکوہ ماضی اپنی عظمت ، برتری کھوچکا ہے انکی یادوں کے زخم اب اس ماحول کے افراد کو جینے نہیں دیتے ۔بڑی سی شاندار عمارت کبھی شان و شوکت میں اپنا جواب نہ رکھتی تھی اب اسکی دیواریں گرتی جارہی ہیں اور قوض خواہوں کی نگاہیں ایک ایک اینٹ پر لگی ہوئی ہیں ـــــ دادی کا کردار جس نے شاندار ماضی گزارا ہے وہ اب بھی بہتر کل کی امید میں زندگی کی آخری سانسیں گزار رہی ہیں ـــــ اور پوتی جسکی زبانی نہ صرف افسانہ بیان ہوا ہے بلکہ اسکی نفسیات کے سہارے افسانہ آگے بڑھتا ہے اسے یہ بھی معلوم ہے آنے والا کل آج سے بدتر ہوگا ـــ اس معاشرہ میں نوکری اب بھی معیوب سمجھی جاتی تھی مگر منو ، چچا اپنے حالات و مشکلات سے تنگ آکر نوکری کی تلاش میں شہر جاتے ہیں ۔تاکہ کسی طرح وہ اپنی عزت بچاسکیں ـــــ دادی دکان میں پڑی ہوئی لونگیں دیکر اپنی جائے پناہ بچانا چاہتی ہیں ـــــ لیکن " گلستاں" محل کی ایک ایک دیوار گرگئی شاندار پھاٹک پل بھر میں ڈھیر ہوگیا ۔اور نیلامی بولی چھ ہزار پر آکر رک گئی ـــــ دادی اس منظر کے بعد زندہ نہ رہ سکیں وہ گریں اور پھر دوبارہ نہ اٹھ سکیں ـــــــ

منو چچا شہر سے ناکام و نامراد آئے اور اس طرح کہ ان میں اور ایک فقیر میں کوئی فرق نہ رہا ـــــــ

" اور اسی رات منو چچا شہر روانہ ہوگئے " افسانہ اسی جملہ سے شروع

ہوا ہے ۔زوال کے اس المیہ کو واجدہ تبسم کے انداز بیان اور تکنیک نے جس طرح اس افسانے میں پیش کیا ہے اس سے قاری اچھی طرح اس ماحول کا عروج اور زوال دیکھ لیتا ہے ۔ وقت کے ساتھ ساتھ حالات بد سے بدتر ہوتے جاتے ہیں اور دادی اس تباہی سے بچنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرتی ہیں ۔ وہ کسی بھی قیمت پر گھر بچانا چاہتی ہیں مگر اسکی خواہش ناکام رہتی ہے اور ایسا لگتا ہے یہ صرف ایک گھر کا زوال نہ ہو بلکہ ایک معاشرہ کی تہذیبی قدروں کے زوال کا مرثیہ ہو ——— ایک ایسا گھر جہاں کی پشتوں نے شاندار زندگی گزاری تھی اب اس شان کا خاتمہ ہو رہا تھا انکی اونچی اونچی اٹھائی ہوئی وہ دیواریں جنھوں نے انکو ایک خاص طبقہ میں مقید کرلیا تھا اب چاروں طرف سے اس طرح گر گئیں انکی انفرادیت بر قرار نہ رہ سکی ———اس غم کو "دادی " کے کردار میں بڑی خوبصورتی سے پیوست کیا گیا ہے ۔سب کچھ مٹنے کے بعد آخر وقت تک وہ اپنی تہذیبی قدروں کی حفاظت کرتی ہیں ———منو چچا کی زبان سے یہ سنکر کہ وہ نوکری کرنے شہر جائیں گے ۔ فوراً انہیں بتاتی ہیں :———

" تو شہر جائے گا ؟ نوکری کرنے ؟ نہیں بیٹا ،
یہ ہمیں زیبا نہیں ۔ہمارے خاندان میں آج تک
کسی نے نوکری نہیں کی ۔" ۱۔

یہ قدر بھی ٹوٹتی ہے نوکری کے لئے منو چچا شہر جاتے ہیں ۔ لیکن زوال کو کوئی روک نہیں سکا ——مکان نیلام ہوا اور منو چچا فقیروں کی طرح بدحال ہوگئے———

۱شہر ممنوع ۔واجدہ تبسم ۔ ص۲۰۰ ۔۱۹۶۱ء ۔نیا ادارہ ، سویرا آرٹ پریس ۔لاہور ۔

تمام افسانہ ایک تسلسل کے ساتھ آگے بڑھتا ہے ہر کردار کی زندگی سے ماضی کی حسین یادیں چمٹی ہیں ! اور ہر ایک کے سوچنے کا انداز مختلف ہے دادی اپنی کھوئی ہوئی شان واپس لینا چاہتی ہیں ! اسے کسی بھی صورت میں برقرار رکھنا چاہتی ہیں ! پوتی جو افسانہ بیان کرتی ہے اسے اپنا یقین ہوجاتا ہے اب وہ اچھے دن واپس نہیں آسکتے - منو چچا زمانہ اور وقت کا خیال رکھتے ہوئے نوکری کے لئے شہر کا رخ کرتے ہیں ! لیکن اس معاشرہ میں زوال لازمی تھا جو آگے رہا !

اس زوال کو واجدہ تبسم نے مختلف انداز میں اپنے افسانوں میں بار بار پیش کیا ہے ! جاگیردارانہ تمدن کی خرابیوں کا جائزہ انکے افسانوں میں خاص طور پر پایا جاتا ہے ! اس ماحول میں بسنے والے گھر باہر ہر جگہ ظالم ہوتے تھے اس موضوع کو واضح انداز میں انھوں نے حال ہی میں چھپے " مجموعہ پھول کھلنے دو " میں پیش کیا ہے لیکن انکے افسانے کے موضوعات ابتدا سے اسی قسم کے پائے جاتے تھے - گھروں کے اندر جہاں انگنت باندیاں کنیزیں خدمت گاری کے لئے ہوتی تھیں - شرفاً ان سے دل بہلاتے انکی زندگیاں برباد کرتے اور پھر بھی لوگ خاموش رہتے - یہاں تک انکی بیگمات کی زبانیں بند رہتیں ـــــ معاشرہ کی یہ برائی واجدہ تبسم کا خاص موضوع رہی ہے جس کے بیان میں انھوں نے بڑی شوخ اور بے باک زبان استعمال کی ہے ـــــ

واجدہ تبسم کے کچھ موضوعات مخصوص ہیں ـ اور ایک موضوع پر انھوں نے مختلف انداز میں اتنے افسانے لکھے ہیں کہ ہر موضوع پر انکا ایک مجموعہ تیار ہوگیا ہے - " اترن " مجموعہ کے تمام افسانے حیدرآبادی ماحول پر ہیں

اور اس ماحول میں جنسی برائی کسی نہ کسی شکل میں سامنے آئی ہے ——

اترن کا موضوع جنس ہے جسمیں یہ جذبہ انتقام کے طور پر کنیز کے دل میں ابھرا اور اپنی مالکن کا اترن پہنتے پہنتے خود مالکن کو اترن دے گیا —— بات صرف اتنی نہیں ہے کہ ایک کنیز جو خود دار تھی اور ہمیشہ اترن پہنتے وقت اسے دلی تکلیف ہوتی تھی - یہ تکلیف اسکے دل میں دھیرے دھیرے بڑھتی رہی اور ایک دن خطرناک انتقامی شکل میں سامنے آئی ————

شہزادی پاشا کی شادی کے صرف ایک دن پہلے وہ دولھا کے پاس ملیدہ لیکر جاتی ہے اور پھر ————

" ایک مرد جسکی پچھلی کئی راتیں کسی عورت کے
تصور میں بیتی ہوں شادی سے ایک رات پہلے بہت
خطرناک ہوجاتا ہے چاہے وہ کیسا بھی شریف ہو ۔" ۱ -

اس کے بعد رات کی تنہائی نے دعوت گناہ دی اور اترن پہننے والی کنیز نے تھوڑی دیر کے لئے اپنے آپکو مالکن کی جگہ دی اور اس احساس نے اسے گہری خوشی بخشی جب سہاگ کا جوڑا بھی اسے اترن میں ملا تو اسکے طنزیہ ، انتقامیہ قہقہے رک نہ سکے !

" پاشا ——— میں ———— میں
میں زندگی بھر آپکی اترن استعمال کرتی آئی -
مگر آپ بھی ———"

———

۱ - اترن - واجدہ تبسم - ص ۹۲ -

اور یہی افسانہ کا اختتام ہے ۔ اور اس طرح باندی اپنے انتقام میں کامیاب ہوگئی ۔

جنس واجدہ تبسم کا مخصوص موضوع ہے جسکو انہوں نے ان گنت افسانوں میں پیش کیا ہے انکی کہانیوں میں معمولی سی تبدیلی ہے ورنہ ماحول کردار اور زبان یہاں تک تکنیک تقریباً ایک سی ہے ۔ ماحول ~~کردار اور زبان~~ وہی شاندار عمارتیں اعلی دستر خوان شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ قیمتی لباس آراستہ رہائش ——— نوکروں کنیزوں کی بہتات ۔ نواب بیگمات اور انکی بیٹیاں جو شہزادیوں کی شکل میں سامنے آتی ہیں ۔ انکے نخرے اور دلار ۔ یہ نواب عیش پرست ہوتے ہیں یہ کسی وقت بھی کسی معصوم کنیز کو اپنی آرام گاہ کی زینت بنالیتے ہیں ۔ کنیزوں میں بھی سپردگی اورکا احساس یعنی وہ پشت در پشت یہ ظلم سہتی آئی ہیں ۔ اور کبھی ان میں کوئی ایسا کردار بھی ابھرا ہے جسمیں اس ظلم کے خلاف بغاوت کی بھی ہمت ہے ۔

" اترن " مجموعہ کے تمام افسانوں میں یہی ماحول میں کردار اور ایک ہی موضوع جنس کو پڑھتے پڑھتے ایسا لگتا ہے جیسے کہانی مختلف انداز میں ذرا سی تبدیلی کے بعد ایک ہی مقررہ فریم میں رکھی گئی ہو ۔ اترن میں ایک کنیز اس بات سے خوش ہے کہ آج مالکن کی اترن لیتے لیتے اس نے بھی ہمیشہ کے لئے انہیں اپنی اترن دیدی ۔ یہی موضوع دوسرے افسانے " جھوٹن " میں زرا سی تبدیلی کے بعد سامنے آیا ہے ۔ جسمیں نواب کا جھوٹن ہمیشہ ایک خادم کھاتا ہے ۔ اور اسکی بیوی نواب کو پسند آتی ہے اور وہ اسے اپنی خواب گاہ میں جگہ دیتے ہیں اترن کی کنیز کی طرح یہ خادم بھی اپنی طنز کو ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے :۔

" بہو ۔ آج سے میں اج کار کی جھوٹن نہیں کھاؤنگا
کیونکہ اب تو سرکار میری جھوٹن کھا ذئیے "

" اترن " اور جھوشن کی کہانی کی یکسانیت کے علاوہ دوسرے افسانوں میں بھی یہی یکسانیت پائی جاتی ہے ! " سستا گوشت" میں وہی نوابی ماحول اور صاحبوں کی عیش پرست زندگی موضوع بنی جو ہر رات ایک پسندیدہ کنیز کو دعوتِ شب گزاری دیتے لیکن ایک بار ایک جاہل خوبصورت الھڑ دوشیزہ پر اس طرح فریفتہ ہوئے کہ اسے اپنا ہمسفر بنانے کی دھوم دھام سے تیاریاں کرانے لگے - " نصیبے والی " کے نواب صاحب نہ صرف ایک محدود بیگم کے مالک تھے بلکہ انکے آٹھ عدد بیٹیاں تھیں ! اسکے باوجود ضرورت مندوں میں آئی ہوئی ایک عورت پر عاشق ہوئے اور شوہر کو ختم کرانے کے بعد پوری شان و شوکت سے اسے بیاہ کر اپنی شہزادی بنالیا —

نوابوں کے اس جنسی کھیل کے آگے بیگمات کی کسی طرح روک ٹوک نہیں ، انکا کام ہے - محلوں کے اندر آرام کرنا اور اپنے نوکروں پر حکومت کرنا ! اور ان نوابوں اور کنیزوں کے جنسی تعلقات اس طرح افسانے پر چھا جاتے ہیں کہ بیگمات کے کردار خود بخود دب جاتے ہیں - نصیبے والی میں صرف اتنا معلوم ہوا بیگم گاؤں میں رہ کر اپنے شوہر کو تفصیلی خط لکھا کرتی تھیں اور اسکے بعد وہی نواب کے عشق کی داستان شروع ہوجاتی ہے ! لیکن "زرا ہور اوپر" کی بیگم زرا مختلف انداز میں نظر آتی ہیں ! وہ نواب صاحب کی عشق پرستی پر بہت دنوں تک روک ٹوک چاہتی ہیں لیکن نواب کے نوکرخانے سے دلچسپی وہ ختم نہیں کرسکیں ! سادی باندیوں کنیزوں سے انہیں نفرت ہوجاتی ہے اور وہ اپنی خدمت کے لئے ایک پندرہ برس کے لڑکے کو مامور کرتی ہیں ! ——————— یہی لڑکا انکے جسم میں مالش کرتا ہے ! مالش پیروں سے شروع ہوتی ہے اور بیگم کی زبان سے "زرا ہور اوپر " کی گردان شروع ہوجاتی ہے ! اور آخر کار خدمت گار لڑکا بھی !

" تلملاکر تیل سے بھری کٹوری اٹھاکر رحمت نے دور پھینک
دی اور اس بلندی پر پہونچ گیا - جہاں تک ایک مرد پہونچ
سکتا ہے اور جسکے بعد" زرا پور اوپر " کیلئے سننے کی ضرورت
بھی باقی نہیں رہتی ——" ا-

یہ بات نواب پر ظاہر ہوتی ہے وہ اسے محل سے نکال دیتے ہیں لیکن دوسرے ہی دن سے دوسرا لڑکا اس کام کے لئے رکھ لیا جاتا ہے ! اور گویا بیگم نے ہی حالات سے سمجھوتہ کرلیا -

ان افسانوں میں " جنس" ایک کھیل ایک دلچسپی کی شکل میں پیش کیا گیا ہے جو کہ عیش و عشرت بھری زندگی کی دین ہے - اس زندگی میں ہر طرح کا آرام ہے - روپیہ کی فراوانی آتی ہے فارغ البالی کی زندگی ہے - زندگی کے اس چین و آرام نے اس زندگی میں سکوت پیدا کردیا ہے اور دل بہلانے کے لئے اسے کوئی ذریعہ چاہئے اور یہ ذریعہ محض عیش ہے یہ ماحول یہ زندگی اور یہ عیاشیاں ایک خاص زمانے کی دین ہیں جسے بقول خود مصنفہ ——— خود انھوں نے دیکھا ہے ! ———
انکے ایک ہی موضوع پر اگر کئی افسانے ایک نشست میں پڑھے جائیں تو ماحول کردار یہاں تک کردار کے عادات و اطوار کی یکسانیت کھلنے لگتی ہے ! انکی شوخ بے باک زبان اکثر حد سے گزر جاتی ہے ! جو ان پر فحاشی کا الزام بھی لگاتی ہے ! عورت تا سراپا اس بے باکی سے بیان کرتی ہیں کہ کچھ بھی باقی نہیں بچتا ! اور پھر نوابوں کی منچلی رنگین راتوں کا جہاں پر ذکر آیا ہے انکا قلم بے لگام گھوڑے کی

ا - زرا پور اوپر - واجدہ تبسّم (مجموعہ اترن) ص ۸۶ - اور سیز بک سینٹر بمبئی -

طرح سرپٹ بھاگتا ہوا نظر آتا ہے ۔ " سستا گوشت" میں نواب صاحب کی رات کا ایک منظر ملاحظہ ہو ۔

" ان ہونٹوں کا سارا رس جیسے انکے جسم میں پھیل گیا ۔
انھوں نے سر شاد ہوکر کہا " اب یہ سوب کپڑے اتار دے ۔" ۱۔

اس نے منہ پھیر کر ایک ایک کرکے سب کپڑے اتارنے شروع کردئے ۔اوپر سے جو بھی تھی سو تھی ۔اندر سے تو سنگ مرمر کا مجسمہ نکل آیا ہو ۔جیسے وہ لمبی لمبی ہانپتی کانپتی سانسیں لیکر بولے " اب ادھر آجا ۔"
اس نے مارے شرم کے اپنے کھلے بال دو حصوں میں سامنے کرکے اپنی عریانی ڈھانکنے کی ناکام سی کوشش کی ۔

وہ اٹھے ۔اسے اپنے قریب کیا ۔خوبصورت نوخیز مرمریں ابھاروں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لیکر انہیں ایک دوسرے سے قریب کرکے انھوں نے بیچ میں اپنی ناک رکھ دی ۔

" ہا " زور سے سونگھ کر انھوں نے کہا ۔خدا کی قسم تو بالکل کوری اور کنواری ہے ۔ہم نوی چھوکری اور نوے کپڑے کی خوشبو سونگھ کر ہی بتاسکتے ہیں کہ یہ استعمال شدہ ہے کی نوا ۔"

جن افسانوں میں جنس موضوع بنا ہے ان میں اس طرح کی عریاں زبان استعمال ہوئی ہے ۔

موضوع جنس اگرچہ واجدہ تبسم کا محبوب موضوع رہا ہے مگر اسکے علاوہ بھی انھوں نے اکثر عورت کی زندگی اسکی نفسیات اور جذبات کو اپنے افسانوں میں بڑی

۱۔ سستا گوشت ۔واجدہ تبسم ۔ (مجموعہ اترن) ص ۱۴۹۔۱۴۳ اوور سیز بک سینٹر ، بمبئی ۔

خوبصورتی سے پیش کیا ہے — گھریلو زندگی پر انکے افسانوں میں سامنے آئی ہے۔
" نتھ کا بوجھ " مجموعہ کے افسانوں میں انھوں نے گھریلو زندگیاں پیش کی ہیں ۔
ان افسانوں میں عورتکی نفسیات کی عکاسی پر خاصی توجہ دی گئی ہے ! ایک عورت
جسکی تمام زندگی کو پر نئے موڑ پر بھاری بوجھ اٹھانا جڑتا ہے وہ اپنی طویل زندگی
کی طرح گزرتی ہے اسکی عکاسی" نتھ کا بوجھ " افسانے میں بڑی وضاحت اور خوبصورتی
کے ساتھ ہوئی ہے ! ایک کنواری لڑکی ایک دلہن کو دیکھ کر سوچتی ہے میں بھی
دلہن بنوں گی لیکن جب نتھ پہننے کی تکلیف دیکھتی ہے تو وہ کبھی نہ دلہن بننے
کا فیصلہ کرلیتی ہے — لیکن وقت کے ساتھ ساتھ وہ بھی بیاہی گئی اور پھر نئے
گھر نئے لوگوں کے ساتھ اسکی زندگی شروع ہوئی ۔ اس نئی زندگی میں رہتے ہوئے
اس کردار نے اپنی پچھلی زندگی کو بڑے جذباتی انداز میں یاد کیا ہے ! افسانے
میں جگہ جگہ جذباتی ٹکڑے دیکھے جاسکتے ہیں !!

" — ابا اب آپ ہوں گے نہ وہ آنگن ۔نہ وہ چڑیاں جن پر
ہر بیٹی کو ناز ہوتا ہے ۔غرور ہوتا ہے کہ میرے میکے کی ہیں۔
اب میں ہوں گی ۔زندگی کی طول طویل اکیلی راہیں ہونگی اور
یہ کڑا بوجھ ۔ایک دم کہاروں نے ایک دیہاتی وداعی گیت
چھیڑ دیا ۔اور قدم بقدم تیز تیز چلنے لگے ۔ میکے کی
گلیاں ، در و دیوار ۔بھائی ۔بہنیں ، سہلیاں سب دور
ہونے لگیں اور میری اماں بھی جنکے بغیر زندگی کا کوئی تصور
ہی نہ تھا اور بوڑھے ابا بھی جنکے بڑھاپے کو میری ضرورت تھی ۔
دور سے کپکپاتی درد میں ڈوبی آنسوؤں سے بوجھل آواز آئی —

کہارو ! ذرا آہستہ ——زرا آہستہ ——————میں نے
بڑے نازوں سے اپنی بیٹی کو پالا ہے -اسے دھکّا نہ
لگنے دینا ! "-۱-

ایسے اقتباس سے واجدہ تبسم کی جذبات نگاری کا فن سامنے آیا ہے ! یہ عورت بھی ایک دن ماں بنتی ہے اور دستور کے مطابق اسے بھی اپنی لڑکیوں کو اسی طرح بدا کرنا ہوتا ہے ——

تمام افسانہ خود کلامی کے انداز میں بیان کیا گیا ہے ——زبان سادہ اور سنجیدہ ہے ——————وقت بڑے فطری انداز میں آگے بڑھتا ہوا نظر آیا ہے ——جنسی موضوعات کو بیان کرنے والا بیباک قلم جب گھریلو زندگی کی عکاسی پر اٹھتا ہے تو اپنی ساری شوخی بھول جاتا ہے ! " نتھ کا بوجھ " مجموعہ کے تمام افسانوں میں عورت ماں بیوی کی شکل میں بار بار سامنے آئی ہے اور خاص کر اسی کی نفسیات پر توجہ ملتی ہے -کبھی ماں کی محبت اور دعائیں بیٹی کو رخصت کرتے ہوئے نظر آتی ہیں ! اور کبھی بیٹی سسرال پہونچکر میکہ کو یاد کرتی ہوئی ——————زیادہ تر افسانے لڑکی کی شادی کی دھوم دھام سے شروع ہوتے ہیں اور بعد کی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں !

گھریلو شادی شدہ زندگی کے علاوہ واجدہ تبسم کے افسانوں میں عشق کی چھیڑ چھاڑ ہی ملتی ہیں -جن میں لڑکی اور لڑکے میں اکثر ایک دولت مند اور دوسرا غریب ہوتا ہے -ایک دوسرے کو چاہنے کے باوجود خاندانی اختلافات سر اٹھاتے ہیں اور پھر لڑکا بغاوت پر اتر آتا ہے ورنہ کبھی لڑکی اپنی جان دے دیتی ہے ! اور کبھی نوجوان اپنی زندگی ختم کرلیتا ہے ! " کھوئی ہوئی منزل " میں دو عشق

۱-نتھ کا بوجھ -واجدہ تبسم (مجموعہ اترن) اور سیز بک سینٹر -بمبئی -ص ۱۱

کرنے والوں کے درمیان ماں کا صرف ایک خط آڑے آیا اور نوجوان نے پائلٹ کا عہدہ اپناکر اڑتے اڑتے اپنی جان دیدی ! " زرد چاند " میں لڑکی اپنے چاہنے والے کو اس انداز سے چاہتی ہے کہ لڑکے کو اندازہ ہی نہیں ہوتا نتیجتاً لڑکے کی شادی کہیں اور ہوجاتی ہے اور لڑکی اندر اندر گھل کر ختم ہوجاتی ہے ۔

" زخم دل اور مہک اور مہک" میں دو عشق کرنے والے ایک نہیں ہوسکتے اور وہ دونوں تنہا زندگی گزار دیتے ہیں ———

ان افسانوں میں عشق کا موضوع ایک ہی شکل میں سامنے آیا ہے ۔ ہمیشہ عشق میں ناکامی رہی ہے اور غموں سے سمجھوتہ کرنا پڑا ہے ——

واجدہ تبسم نے تقسیم ہند کے بعد لکھنا شروع کیا اور اس مدت میں انہوں نے بہت کچھ لکھ لیا ۔ انکے سات مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں ۔ ہر مجموعہ میں ایک موضوع لیا ہے —" نتھ اتر آئی " میں صرف طوائف کی زندگی کو موضوع بنایا ہے ۔ " پھول کھلنے دو " میں قومی یکجہتی کو موضوع بنایا ہے ——

——— xxx ———

قاضی عبدالستار:- ———— (افسانوں کے موضوعات)

انگریزوں کی حکومت ختم ہوگئی ، ہندوستان آزاد ہوگیا ! ————
آزادی کی اس تحریک نے ایک طرف اگر انگریزوں کی غلامی سے ہندوستان کو نجات دلائی تو دوسری طرف ظلم ، زمیندارانہ نظام ، اور آمرانہ زندگی پر بھی ضرب لگائی۔ ۵۰ ء تک ملک آزاد ہوچکا تھا تقسیم کا واقعہ بھی پیش آچکا تھا —— شہر میں بسنے والے لوگ جدید ڈھنگ کے ذریعے خود کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کی کوشش میں لگے تھے -اور ہندوستانی گاؤں ، قصبات ، اور بہت سے اضلاع کے زمیندارانہ ٹھاٹ باٹ پر زوال آرہا تھا -انکی نظروں میں ان محلوں اور بلند دروازوں کو ٹٹولنے لگی تھیں جن میں رہنے والوں کے ٹھاٹھ باٹ اور خدائی احکامات سہتے سہتے آخر کار مرجاتے تھے ——

قاضی عبدالستار نے جب ادھر ادھر دیکھا تو منظر کچھ ایسا ہی تھا ! ——
ان کے افسانوں کے موضوعات سیتا پور کے قصبات ، گاؤں اور چھوٹے چھوٹے اسٹیشن ہیں جن میں مسلمان زمیدار طبقہ اب اپنی آن بان کھو رہا تھا —ان کی عمارت کے بلند دروازے ، منقش دروازے اور لکھوری اینٹوں پر چنی ہوئی ٹھوس اور اونچی اونچی دیواریں اب منہدم ہوتی جارہی تھیں ! ————ان کے گھروں کا مال و متاع ، رہی سہی زندگی کو بچانے اور بچی کچی عزت کے لئے کوڑیوں کے مول بکتا چلا جا رہا تھا ! ——اور ان سب چیزوں کا خریدار وہی مظلوم ، اور کمزور طبقہ تھا جن پر ایک زمانے میں انھیں زمینداروں کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی +——

جو پہلے ان آقاؤں کے سامنے نظر ملاکر بات کرنے کی جرأت نہ کرسکتے تھے ، ان کے آگے منہ کھولنے کی ہمت نہ کرسکتے تھے ! ! اب آزادی کے ساتھ کھلیانوں میں نذر پوکر اناج کے بوروں کو گن گن کر اپنے گھروں میں ڈھیر کرتے جارہے تھے ! ـــــ ان کے گھروں میں اب کھنکتے ہوئے سکوں کی آوازیں گونجنے لگی تھیں ، گھی کے چراغ جل رہے تھے ، اور چولہوں پر ایک ایک اچھے پکوان پک رہے تھے ـــــ انکی زندگی کو ایک نیا لطف ، اور جینے میں ایک نیا مزا مل رہا تھا ! ـــــ گاؤں کا نظام اب زمینداروں کے ہاتھ سے نکلکر خود کسانوں کی بنائی ہوئی پنچائت ، گرام سبھا اور مکھیا کے ہاتھوں میں چلا گیا تھا ! ـــــ قاضی عبدالستار نے یہ سب کچھ دیکھا ، محسوس کیا اور اپنے فن کی چابکدستی سے اسے افسانے اور ناولٹمیں بیان کردیا ! ـــــ انہوں نے بہت کم افسانے لکھے ، بہت تھوڑے ناولٹ لکھے ، اور چند گنے چنے ناول تحریر کئے ـــــ انکی تحریر میں منظر کشی کی پھر پور گرفت ہے اور قاری کے سامنے وہ پورا ماحول ہو بہو شکل میں ناچنے لگتا ہے جسکا ذکر وہ کرنا چاہتے ہیں ! ـــــ ان کے افسانوں میں کردار کی مناسبت سے مکالموں کا استعمال ہوتا ہے ـــــ ایک محکوم جاہل کسان کی زبان کو اسی طرح افسانے میں بھی بیان کیا گیا ہے ۔جس طرح زمیندارانہ دور میں وہاں کا ایک دیہاتی اپنے آقا کے سامنے بولا کرتا تھا ـــــ اور جب زمیندار گھرانے کا کوئی فرد کردار کی حیثیت سے ان کے افسانوں میں ابھرا ہے تو اس کے عادات و اطوار ، افعال و کردار ، اور لہجہ کا اتار چڑھاؤ اس دور کی زندگی کی بالکل صحیح عکاسی کرتا ہے ! ـــــ انھوں نے ایسے ماحول کو باقاعدہ دیکھا ، اسکا تجزیہ کیا اور پھر اس دور کی زندگی

کی بالکل صحیح تصویر کشی قلم بند کیا — خود قاضی عبدالستار کا بیان ہے کہ :—

" ہم نے اس موضوع کو جس طرح برتا ہے اسکا سلیقہ ہمارا ہے - ہم نے طبقات کے بجائے ، فرم کو اپنا موضوع بنایا ہے - یعنی دوسرے الفاظ میں ہم نے پرانے کایوسی بوسیدہ طبقوں اور فرموں کو توڑ دیا ہے - اور فرد کے باطن میں جھانک کر انسانیت کا تماشہ دیکھا ہے ! - " -۱-

" پیتل کا گھنٹہ " — اس افسانے کا موضوع شہری زندگی سے بالکل الگ اودھ کے قصباتی جاگیردارانہ مسلم نظام کا زوال اور انکی تہذیبی قدروں کا اختتام ہے — جو یقیناً ۵۰ء کے بعد افسانے کو نیا موضوع بخشتا ہے — کہانی کے کردار یا تو بلند اور مضبوط حویلی میں عیش کرنے اور حکم دیتے ہوئے نظر آتے ہیں — اور یا تو گاؤں کی کچی اور ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں پر ہانپتے اور دوڑتے نظر آتے ہیں ! — انھیں کرداروں میں بالترتیب زوال اور عروج پیدا ہوتا ہے جس کے سبب سے اب بلند حویلیوں میں آہ و بکا کی آوازیں ابھرتی ہیں اور ہانپتے دوڑتے ہوئے غریب کسان ، ٹم ٹم ، تانگوں اور سواریوں میں بڑے اطمینان سے سفر کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ! — یہی عروج و زوال کہانی کو نئی معنویت بخشتا ہے جسکو فنکار نے اپنے اسلوب ، اپنی فکر ، اور اپنے ذاتی مشاہدہ کی روشنی میں افسانے کی صورت دی ہے —

ضلع سیتا پور کے ایک قصبہ " بھسول " میں جہاں کبھی قاضی انعام حسین آف بھسول اسٹیٹ کی شہرت امریت اور دبدبہ کا ڈنکا بجتا تھا - جس پیتل کے گھنٹہ کی ایک ہی آواز پر انکا حکم صادر ہوا کرتا تھا - گردش حالات نے اسی گھنٹہ کو چند

۱- نیا افسانہ اور اسکی توجیہ - قاضی عبدالستار ۱۸۲۰ ء جدیدیت اور ادب مرتبہ آل احمد سرور

روپیوں کے عوض رعایا کے ہاتھوں بیچ دیا تھا ! ——— یہ سب تماشا کہانی کا کردار ، " میں " (جسکے ذریعہ سے پوری کہانی بیان کی گئی ہے) شروع سے لیکر انتہا تک دیکھا کرتا ہے ——

کافی زمانہ بیت چکا ہوتا ہے ایک بار بھسول کے قریب سے اسکا گزر بذریعہ بس ہو رہا ہوتا ہے کہ اچانک بس وہاں خراب ہوجاتی ہے وہ بس سے اتر کر تھوڑی دور پر کسی گاؤں میں ایک مسجد کے مینار دیکھتا ہے اسے یہ جگہ جانی پہچانی سی لگتی ہے اور پوچھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ " بھسول " ہے ——بھسول ؟ ! —— اسے یہ نام سنتے ہی اپنی شادی کا زمانہ یاد آجاتا ہے -وہ تمام باتیں نظروں تلے گھومنے لگتی ہیں جب وہ شادی کے بعد پہلی بار اپنے سسرالی عزیز کی عظیم الشان حویلی میں قدم رکھتا ہے ——یہ گھر بھسول کے واحد زمیندار ، قاضی انعام حسین صاحب کا گھر تھا جن کے چہرے پر امیروں جیسا دبدبہ ، اور حاکموں جیسا غرور تھا ——جنکے گھر کی ایک ایک چیز خاندانی رئیس ہونے کی غازی کر رہی تھی ! —— بھسول کی رعایا انکے اشارے کی منتظر رہتی تھی اور سارا علاقہ ان کے نام سے لرزتا تھا ——یا تو ایک وہ زمانہ تھا کہ جب پہلی بار اسکی نظر قاضی صاحب پر پڑی تو اس نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا :——

" میں اندر سلام کرنے جارہا تھا کہ ایک بزرگ نے ٹوک کر کہ روک دیا ——وہ کلاسکی کاٹ کی بانات کی اچکن اور چوڑے پائنچے کا پاجامہ اور فر کی ٹوپی دئیے میرے سامنے کھڑے تھے ، میں نے سر اٹھا کر انکی سفید پوری مونچھیں اور حکومت سے سینچی ہوئی آنکھیں دیکھیں انھوں نے سامنے کھڑے ہوئے خدمتگار کے لئے ہاتھوں سے پھولوں کی بدھیاں لے لیں اور مجھے

پہنائے گئے ——— پھر میرے ننگے سر پر پاتھ پھیرا اور
مسکاکر کہا " اب تشریف لے جائیے " ۱۔

اسکی نظر میں قاضی صاحبکی ایک عظمت بیٹھ گئی تھی انکا دبدبہ دیکھ کر وہ انکی شاندار زندگی کا قائل ہوگیا تھا ——— یا پھر اب وہ زمانہ آگیا تھا کہ دوسری بار اتفاقیہ جب قاضی صاحب کے گھر جانے لگا تو خود ان کے گاؤں کا ایک غریب کسان جو کبھی انکی رعایا تھا اب بڑے مزے میں بغیر اجازت کےپگڈنڈی پر بیٹھا بیٹھا اس کے پاتھ سے جلتی ہوئی ماچس کی تیلی لیکر اپنی بیڑی سلگانے لگتا ہے :—

" میں ابھی سگریٹ سلگا ہی رہا تھا کہ ایک مضبوط کھردرے
دیہاتی پاتھ نے میری چٹکیوں سے آدھی جلی ہوئی تیلی
نکال لی ۔میں اسکی بے تکلفی پر ناگواری کے ساتھ چونک
پڑا ——— مگر وہ اطمینان سے اپنی بیڑی جلا رہا تھا ! وہ
میرے پاس ہی بیٹھ کر بیڑی پینے لگا یا بیڑی کھانے لگا ! "— ۲۔

اور بے چارا قاضی انعام حسین آف بھسول اسٹیٹ اور انکی حویلی کی حالت تو یہ تھی کہ جب وہ ان کی حویلی کے قریب پہنچا تو اسنے دیکھا کہ :—

" ڈیوڑھی کے دونوں طرف عمارتوں کے بجائے عمارتوں کا ملبہ
پڑا تھا ! ——— دن کے ۳ بجے تھے وہاں اسوقت نہ کوئی
آدمی تھا نہ آدم زاد ۔کہ ڈیوڑھی سے قاضی صاحب نکلے ۔—

۱۔پیتل کا گھنٹہ ۔قاضی عبدالستار ۔ص ۱۰

۲۔پیتل کا گھنٹہ ۔قاضی عبدالستار ۔ص ۹

لمبے قد کے جھکے ہوئے ، ڈورے کی قمیض ، میلا پاجامہ ،
اور یہ موٹر ٹائر کے تلوؤں کا پرانا پمپ پہنے ہوئے ماتھے پر
پتھیلی کا چھجہ بنائے مجھے گھور رہے تھے میں نے سلام
کیا ۔" ۱۔

قاضی صاحب اسے پہچان جاتے ہیں اور مسرت و خوشی کے ساتھ اندر لے جاتے ہیں ——گھر کی حالت بھی اب بگڑی ہوئی ہوتی ہے ——قاضی صاحب کی بیگم پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس چادر کو روپٹہ بنائے ہوئے مفلسی کی زندگی گزار رہی تھیں ! ——سب کچھ بک چکا تھا ، یا ختم ہوچکا تھا ! لیکن گھر میں آئے ہوئے داماد کی خاطر اور اس کے آرام میں ان لوگوں کے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ! —— آخر کٹر زمیندارانہ خون اور امیرانہ مزاج تھا ——صبح کا ناشتہ انواع و اقسام چیزوں کے ساتھ پلنگ پر چنا ہوا تھا اور چلتے وقت قاضی صاحب کی بیوی نے ۵۱ روپے مٹھائی کے اور ۱۰ روپیہ کرائے کے جب عطا کئے تو ——نہ چاہتے ہوئے بھی اسے لینے پڑے ——اور وہ خوش خوش انکی مہمان نوازی کو سوچتا ہوا ایکہ پر بیٹھ کر رخصت ہولیا ! ——راستہ میں وہ اپنے ہی ایکہ پر بیٹھے ہوئے ایک ساہوکار کے پاس جب پیتل کا وہی گھنٹہ دیکھتا ہے جسکو اس نے فصل کرتے وقت قاضی صاحب کے فصل خانے میں دیکھا تھا تو ان کے زوال کی کہانی چابک بنکر اس کی پیٹھ پر پڑتی ہے اور وہ تلملا اٹھتا ہے ! —— اسکو ملے ہوئے روپیوں اور صبح کے شاندار ناشتہ میں اب کسی کی آہ سنائی دینے لگتی ہے اور اس طرح ایک زمیندار کے عروج و زوال کی یہ کہانی دیکھ کر وہ چپ چاپ چل دیتا ہے ۔افسانہ ختم ہوجاتا

۱۔ پیتل کا گھنٹہ ۔ قاضی عبدالستار ۔ص ۱۱

ہے لیکن قاری کے لئے بہت سے پہلو سوچنے کے لئے چھوڑ جاتا ہے ——————
قاضی عبدالستار نے اس افسانے میں جدید دیہات کی فضا آفرینی کی ہے اب یہ
فنکار کا کمال ہے کہ اس نے جس زندگی کی ترجمانی کی ہے اس سے بھی بیک وقت
نفرت بھی ہوتی ہے اور پیار بھی آتا ہے ۔زمیندار طبقہ کی حاکمانہ زندگی ، اور
صبر و غرور کو دیکھ کر اس کے زوال پر خوشی بھی ہوتی ہے ، اور شاندار حویلی کی
ایک ایک چیز کو کوڑیوں کے بھاؤ بکتے ہوئے دیکھ کر رنج بھی ہوتا ہے ——————
ان کے افسانے میں غریب اور کسان طبقہ کی طرف سے بغاوت کا دھیما اور سنبھلا
ہوا انداز کہانی کو حقیقت نگاری سے بہت قریب کر دیتا ہے اور قاری کے لئے اس ماحول
اور زندگی کے ہر گوشہ کو اچھی طرح جھانک کر دیکھنے کا موقع ملتا ہے ——

قاضی صاحب کی ایک اور کہانی " مالکن " اودھ کی قصباتی زندگی پر ایک
کامیاب کوشش ہے ۔جسکو افسانہ نگار نے ماضی اور حال کے دائیرے میں سمیٹنے کی
بھر پور کاوش کی ہے ۔زمینداروں کی بیوہ بیگمات کی نجی زندگی ، انکی آرزوؤں ،
خوابوں ، مایوسیوں ، اور پریشان خیالوں کو مرکزی حیثیت دیکر افسانہ کا پلاٹ بنایا
گیا ہے ۔انکی بد سے بد تر زندگی کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔اور اسی گرے
ہوئے طبقہ کو اٹھتے ہوئے دکھایا ہے جو زمیندارانہ دور میں بیگمات کے آگے سر تسلیم
خم کئے رہتا تھا ——یہ تمام باتیں قدیم و جدید دیہاتی معاشرہ میں ایک ساتھ اس
طرح روشنی ڈالتی ہیں کہ قاری ماضی اور حال کے دونوں معاشروں سے برابر کا
فکری رشتہ ہمدردی کے ساتھ رکھنا چاہتا ہے ۔یوپی کے ایک گاؤں رونق پور کی
" بیوہ مالکن " اپنے سرتاج میر محمد علی بیگ کی وفات کے بعد اکیلی تنہا اپنی
لق و دق حویلی میں اپنے شوہر کی عزت اور حویلی کی عظمت کو بر قرار رکھنے کے

کے ہزار جتن کر ڈالتی ہیں ــــــ مگر ملک کے بدلتے ہوئے حالات ، کسان اور غریب طبقہ پر حکومت کی سر پرستی نے مالکن کی کسی کوشش کو کار گر نہ ہونے دیا ــــ زمینداروں کے خاتمہ کا اعلان کردیا گیا ــــــ زمینیں ، باغات ، کھیت اور جاگیری سب دیکھتے ہی دیکھتے دوسروں کے ہاتھوں میں چلی گئیں ! ــــــــ اور گھر کی رہی سہی دولت اور پونجی مقدمے کی نذر ہوکر اب مالکن کو منہ چڑھا رہی تھی ! ــــــــ دور دراز کے رشتہ دار سب پاکستان جاچکے تھے اور مالکن بغیر کسی اولاد کے سائیں سائیں کرتی ہوئی اجڑی حویلی کا منظر اپنی بوڑھی آنکھوں سے دیکھنے کے لئے زندہ تھی ! ــــــــ

" پھر ایک دن جب وہ نماز پڑھ کر اٹھیں ، مونج کی پٹاری کے پاندان سے کھجور کی گٹھلیوں کے دو ڈلے اور پتی کی تمباکو کا پھنکا لگایا ۔ اور کھنڈر کے اس حصہ کی طرف چلیں جو کسی زمانے میں باورچی خانہ کہلاتا تھا ــــ بغیر دروازوں کے لمبے چوڑے کمرے کے کونے میں لڑھکی ہوئی مٹی کی ہانڈیوں کے منہ دیکھے ۔ جو ان کے پیٹ کی طرح خالی تھے ، گھٹنوں پر ہتھیلیاں جماکر آہستہ آہستہ جھکتی ہوئی وہیں زمین پر بیٹھ گئیں ! ــــ جیسے جواری سب کچھ ہار کر بیٹھ رہے ــ انکی لنگڑاتی نگاہیں اس سنسان ویران لق و دق کھنڈر میں رینگتی رہیں ــ جسکی چھتیں گرچکی تھیں !! دھنیاں جلا چکی تھیں ، دروازے بک چکے تھے ، اور جسکی در و دیوار

خدمت گزار انسانوں کی مودب پرچھائیوں کے زنجگوں کو
ترستے تھے ، اور شائد ترستے ترستے بھول چکے تھے -
انکی جھوکی آنکھوں سے دو میلے میلے آنسو گرے اور
پیوند لگے پوئے موش تنزیبکے کسمیلے دوپٹے میں کھو گئے -"۱-

رونق پور کی نام نہاد مالکن پر اب فاقے کی نوبت آگئی تھی ، اپنے پرکھوں کی اس حویلی سے باہر نکلنا وہ حرام سمجھتی تھیں کہ قدرت نے غیبی آواز کے ذریعہ ان کو یہ بشارت دی کہ گھر بیٹھ کر کرتے سلائی کرکے پیٹ بھرنا بڑے بڑے بزرگوں اور درویشیوں کی بیویوں نے بھی کیا ہے -ان کے گلے سے لرزتی ہوئی ایک آواز نکلی — اور انکی حویلی کا ایک پرانا اور وفا دار خادم گلاب لال ، جو اب چودھری گلاب بن چکا تھا مالکن کے حکم کا منتظر چوکھٹ پی کھڑا تھا ——سسکتی ہوئی آواز نے چودھری گلاب کے کانوں تک ایک خبر پہنچائی ——گھر میں بیٹھے بیٹھے اکیلی گھبرایا کرتی ہوں کہیں سے کرتے کا کپڑا لادو میں کپڑے پی سیکی وقت گزارا کروں" — بات کچھ بھی نہ تھی لیکن بوڑھے گلاب لال کی تجربہ کار نگاہیں مالکن کو بھوک سے بلکتا ہوا دیکھ رہی تھیں ! ——چودھری گلاب کے بڑی راز داری سے اس کام کو انجام دیا اسطرح کی مالکن کی عزت اور حویلی کے پرکھوں پر کسی طرح کا کوئی حرف نہ آسکے ! ——بیچاری مالکن اپنی بوڑھی آنکھوں کی دھندلی روشنی ، اور کمزور ہاتھوں کی نازک انگلیوں سے سوئی چلاتی رہیں اور یہ سمجھتی رہیں کہ وہ چیت پور کے ٹھاکر گھنشیام سنگھ کے کرتے سی سی کر اسے واپس کرتی جارہی ہیں——

۱-مالکن - قاضی عبدالستار (پیتل کا گھنٹہ) ص ۲۲ - ۲۲

لیکن بات کچھ اور تھی بے لوث رشتہ ، اور خلوص کے جذبہ نے گلاب لال کے بیٹوں اور بیوی نے مالکن و گلاب لال کو گندے رشتوں میں ملوث دیکھنا شروع کردیا ——— وفادار خادم سے یہ الزام سہا نہ گیا اور اس نے دنیا سے اٹھ جانا ہی بہتر سمجھا ا ——— مالکن کو اسکی موت کی صحیح وجہ ابھی معلوم بھی نہ ہوسکی تھی کہ ایک دن چودھری گلاب کی بہو وہی کرتے لاکر مالکن کے ہاتھ پر رکھدیتی ہے "ای کرتے آپے دھرلیو" ——— مالکن کے سامنے چودھری گلاب کی نمک حلالی اپنا فرض ادا کرچکی ہوتی ہے اور مالکن حویلی کی ڈھکی چھپی عزت کو بے نقاب کرکے اب کھلے عام اس پیشہ کو اپنانے کا اعلان کردیتی ہیں ا ——— افسانہ انہیں الفاظ کے ساتھ ختم ہوجاتا ہے :—

" شام کو ڈیوڑھی پر کھڑے ہوئے چیت پور کے ٹھاکر گھنشیام سنگھ سے ملکن کہ رہی تھیں ——— اپنے کرتوں کی تنزیب تو آپ بھیجتے رہیئگا ، لیکن پہلے میرے یہ چاروں کرتے بکوادیجئے "۔۱۔

اس کہانی کا موضوع بھی زمیندارانہ تہذیب کا زوال ہے جو ان کے اکثر افسانوں اور ناولٹ کا مرکزی خیال ہیں ا ——— زبان و بیان کی نزاکتوں کو اچھی طرح پرکھا ہے اور پھر فن کا احترام کرتے ہوئے اپنے دلکش اسلوب کے ساتھ سماج کے بدلتے ہوئے دھارے کو بیان کردیا ہے ——— افسانے کو غور سے پڑھنے پر بہت سے فکری پہلو سامنے آتے ہیں ا ——— اور ذہن اس منزل پر آکر کچھ سوچنے لگتا ہے کہ شائد انسانی زندگی بھی خواہ وہ کتنی ہی مطمئن اور طاقتور کیوں نہ ہو کسی نہ کسی طاقت کے آگے بالکل بے بس ہوجاتی ہے ۔ اور وہی زنجیریں جو کبھی دوسروں کے پیروں میں

۱۔ مالکن ۔ قاضی عبدالستار ۔ (پیتل کا گھنٹہ) ص ۲۲

تھیں وہ ان کے پاؤں میں بھی لپٹ سکتی ہیں ! ——— اس موضوع کو ہمارے دور کے بعض دوسرے افسانہ نگاروں نے بھی پیش کیا ہے ۔ مگر انکی سر زمین میں کوئی گاؤں ' کوئی قصبہ یا کوئی حویلی نہیں اور اگر اتفاق سے کسی افسانہ نگار کے یہاں افسانے کی بنیاد یہی علاقہ ہے تو اس کے یہاں مرکزی خیال کسی اور موضوع کی طرف اشارہ کرتا ہے ——— قصباتی اور دیہاتی زندگی میں بدلتی ہوئی تہذیبی قدروں کا جو بلیغ احساس قاضی عبدالستار کے یہاں ملتا ہے وہ اس دور کے دوسرے افسانہ نگاروں کے یہاں نسبتاً کم ہے ——

——— xxx ———

خواجہ احمد عباس :-

خواجہ احمد عباس کے افسانوں کے موضوعات ، ہمعصر ہندوستانیوں کے مسائل ، اس ملک میں رہنے والے کروڑوں کسان ، نچلے طبقے کے انسان ، اور بدلتے ہوئے سماجی ڈھانچہ میں کمزور طبقہ کو اٹھانے کی کوشش ہیں - انہوں نے متوسط پڑھے لکھے نوجوانوں کو بھی اپنی کہانیوں کا موضوع بناکر شہری زندگی میں تلاش معاش ، تلاش مکان ، اور محنت و مشقت کرتے ہوئے دکھایا ہے ۔۔۔ ان کا موضوع آزادی کے بعد کا ہندوستان ہے ۔[۱] اس میں سماجی اور سیاسی تبدیلیوں کا اثر ہندوستانیوں پر ، شہر اور گاؤں کی زندگی کا فرق ، اور دونوں کا تعلق ، صنعتی اور مشینی زندگی کا اثر ، ذہنی بیداری اور نا انصافی کے خلاف احتجاج ان کے افسانوں کے نمایاں پہلو ہیں ۔ ۔۔۔ ان کے افسانوں میں ہمیشہ یہ کوشش نظر آتی ہے کہ حقیقی زندگی کو ادب میں پیش کیا جائے ، اور سماجی ڈھانچہ کو ایک ایسی مرتب شکل عطا کی جائے جس میں حق اور باطل کے فرق کو صاف صاف محسوس کیا جاسکے ۔ ۔۔۔

خواجہ احمد عباس نے خود اپنی تحریر کا مقصد یہ بتایا ہے کہ :-

> " تخلیق ادب کے ذریعہ یہ انقلابی کام جہاں دنیا کے عظیم ادیبوں جیسے ٹالسٹائے ، گورکی ، چیخوف ، ٹیگور اور سرت چٹرجی ، منشی پریم چند ، اپٹن سنکلیر ، آرنسٹ ہیمنگوے نے اپنے ادب کے ذریعہ انجام دیا ہے اور دوسرے عظیم ادیب جیسے اسٹائن بیک ، ژاں پال ، سارتر اور کرشن چندر آج کر رہے ہیں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔چھوٹے

۱- یوں تو خواجہ صاحب نے آزادی سے پہلے بھی کہانیاں لکھیں لیکن اس وقت یہیں بحث صرف ان کے موضوعات سے جو ۵۰ کے بعد انکے افسانوں میں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں ۔۔

پیمانے پر میں بھی کر رہا ہوں یا کرنے کی کوشش
کر رہا ہوں ! ——" ۱۔

انھوں نے خود اپنے افسانوں میں موضوعات کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ :—

" انسان کی اندرونی زندگی ، اسکے ذاتی نفسیاتی
مسائل ، اور اسکی بیرونی ، سماجی اور اقتصادی زندگی
میں ایک گہرا تعلق اور رشتہ ہے ۔جو کچھ دنیا میں ،
اسکے اپنے ملک اور اسکے سماج میں ہوتا ہے ، اس کا
اثر اسکے اپنے کردار پر ، اور اسکے افعال پر پڑتا ہے ،
جیسے جیسے دنیا ، سماج ملک کا اقتصادی ، اور سماجی
نظام بدلتا جاتا ہے ۔اسی طرح انسان بھی بدلتے
رہتے ہیں ——
آج کے انسان وہ نہیں ہیں جو آج سے چار سو ، پانچ سو
سال پہلے تھے ——پرانے ادبی سانچوں میں وہ فٹ
نہیں بیٹھتے ——ان کو نئے ڈھنگ سے دیکھنے کی
دکھانے کی ، جانچنے کی ، پرکھنے کی ضرورت ہے —
آزادی کے بعد تو سماجی اور نفسیاتی تبدیلیاں اور تیزی
کے ساتھ ہو رہی تھیں ۔ان پڑھ کسانوں کے بیٹے زراعتی
یونی ورسٹیوں میں پڑھ رہے ہیں ۔جن کے باپ آج بھی

۱۔ نئی دھرتی نئے انسان ——خواجہ احمد عباس ۔ص ۷۰ ۔

لکڑی کے حل چلاتے ہیں ، وہ ٹریکٹر اور بڑے بڑے اور
بُل ڈوزر چلا رہے ہیں ——جن کے باپ دادا زمیندار
اور ساہوکاروں کے آگے ماتھا ٹیکتے تھے وہ آج سر
اٹھا کر اپنا حق مانگ رہے ہیں ——— یہ بلتا ہوا
ہندوستان اور بدلتے ہوئے ہندوستانی میرے افسانوں
کا موضوع ہیں —" ۱۔

خواجہ احمد عباس ایسے فنکار ہیں جنکے افسانوں میں ہم موجودہ ہندوستانی معاشرہ اور سماجی کا اثر لوگوں کی ذہنی ، اور عمل زندگی پر آسانی سے دیکھ سکتے ہیں ۔انکا انداز سیدھا سادہ افسانوی رنگ کی آمیزش سے مبّرہ ہوتا ہے انکی ہر کہانی کا ایک مقصد ہوتا ہے انکا ہر کردار جدو جہد کرتا ہوا نظر آتا ہے ۔مفلسی اور غربت کے خلاف ، سرمایہ داری اور ساہوکارانہ نظام کے خلاف ، ———پسماندگی اور قابل رحم زندگی کے خلاف ، ——— ~~پسماندگی~~ جہالت اور اندھے عقیدوں کے خلاف ا ———گندگی اور مدقوق بیماریوں کے خلاف انکا افسانوی کردار ، ایک صحت مند اور محنت کش زندگی کا قائل ہے ——اور ہر لمحہ کسی خوش آئند مستقبل کا منتظر نظر آتا ہے ۔۔۔

انکا افسانہ "نیا شوالہ" نوجوان کسانوں کی ذہنی بیداری ، اور شعور کی رو پر مبنی ایک کہانی ہے ——اندھے عقیدوں کے خلاف احتجاج ، اور دیہاتی زندگی کو صنعتی اور مشینی دور کی ترقیوں کا احساس دلانا اس افسانہ کا موضوع ہے ——

گاؤں کا ایک نوجوان منگل دوسرے دیہاتی نوجوانوں کے ساتھ پیسے کمانے کی فکر میں گاؤں سے قریب ہی اس جگھ پر نوکری کرنے لگتا ہے جہاں پتھر ،

۱۔ نئی دھرتی نئے انسان ۔خواجہ احمد عباس۔ ص ۲۔۵

سمنٹ اور چونے کی مضبوط دیواریں مشینی ذرائع سے بنائی جا رہی تھیں ——
بہت سے مزدور کام کر رہے تھے - شہر کے بڑے بڑے انجنئر س ، جدید مشینوں کے ذریعہ
سے اس کام کو انجام دے رہے تھے —— یہاں ایک باندھ کی تعمیر ہو رہی تھی جس کے
ذریعہ اس علاقے میں پانی فراہم کرکے کسانوں کی زراعتی پیداوار بڑھانے میں مدد دی جاتی -
حکومت گاؤں والوں میں سماجی بیداری لانا چاہتی تھی ان کو آسانیاں
پہچانا چاہتی تھی مگر اس گاؤں کے کسان تو کچھ اور ہی سوچ کر سہمے جارہے تھے :—

"اور اب یہ بھاینک خبر ایک دم ہر طرف پھیل گئی کہ
یہ مندر جو ان لوگوں کی زندگی کا سہارہ ، ان کی
شردھا کا مرکز تھا نیست و نابود کردیا جائیگا ——
اسکو ڈبو دیا جائیگا ، کیوں کہ پہاڑوں کے جو
بند باندھا جارہا تھا اسکے پورا ہونے سے اس پوری
وادی کو غرقاب کر کے ایک بڑی جھیل بنا دیا جائیگا -
یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی - پچھلے پانچ سال سے
پہاڑوں کے اس طرف جو بندھ بندھ رہا تھا اسکی وجہ
سے ان لوگوں کی زندگی میں آئے دن نت نئی تبدیلیاں
آرہی تھیں - شروع شروع میں تو انھیں اسکے متعلق سنی
سنائی باتیں سپنے کی طرح سندر اور عجیب لگیں کیوں
کہ جادو کے اس عجیب و غریب ڈبے میں سے ان کو دور
دلی راجدھانی میں بسنے والے نیتاؤں کے بول بھی
سنائی دئیے مگر گاؤں کی چوپال میں بیٹھ کر ان کو یہ

باتیں بہت دور کی لگیں ۱۱ - " ا-

گاؤں کے یہ باشندے اپنی تاریک دنیا میں صنعتی انقلاب ، اور مشینی دور کے فوائد سے بالکل بے خبر تھے ـــــ انکا تو ہر ذریعہ ، ہر کام ، اور ہر مسئلہ اس دو ہزار سالہ پرانے مندر میں بسنے والے بھگوان جی حل کر دیا کرتے تھے ـــــ پھر بھلا یہ کسان کیوں کر اس مندر کو منہدم ہوتا دیکھ سکتے تھے ـــــ وہ اپنی زندگیاں قربان کر سکتے تھے مگر مندر کو ٹس سے مس کرنا پسند نہیں کرسکتے تھے ـــ کیوں کہ ، کیوں کہ ان لوگوں نے اپنے باپ دادا سے یہ سن رکھا تھا کہ اس جگہ پر بھگوان کرشن جی زمین سے نکلے تھے پھر بھلا بھگوان کی مرضی کے بغیر ان کو کہیں اور کیسے رکھا جاسکتا تھا ؟؟؟ ـــــ

لیکن اسی گاؤں کا نوجوان ، منگل ، اب نہر کے پانی کی ضرورت کو سمجھنے لگا تھا ـــ اپنے گاؤں والوں کے اندھے عقائد کو ختم کرکے وہ ایک خوشحال زندگی لانا چاہتا تھا ـــ وہ جانتا تھا کہ اب محض مندر میں جاکر بھگوان سے بارش کی پرارتھنا کرکے کھیتی باڑی کا کاروبار نہیں چل سکتا ـــ بلکہ نئے ٹیکنیکل ذریعوں سے پانی کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کیا جاسکتا ہے - منگل نے سب سے پہلا قدم جو اٹھایا وہ اپنے کنبہ سے باہر کی ایک لڑکی سے شادی کرنے کا ارادہ تھا - یہ بات گاؤں والوں اور خود اسکے گھر والوں کے لئے قابل لعنت تھی ـــــ دوسرا مسئلہ اسکے لئے مندر کو منہدم کرکے بھگوان کی مورتی کو ایک دوسرا مندر بناکر اس میں رکھنا تھا ـــــ سیدھے سادے گاؤں والے اس بات پر آمادہ ہوگئے کہ اگر بھگوان کی

۱- نیا شوالہ - خواجہ احمد عباس (نئی دھرتی نئے انسان) ص ۱۰

مرضی ہو تو ضرور ایک دوسرا مندر بناکر اس میں مورتی کو رکھا جاسکتا ہے ——

ایک رات چپکے سے منگل نے مورتی کو مندر سے نکالکر اونچی پہاڑی میں دفن کردیا ——صبح جب مندر میں مورتی نہ ملی تو تلاش کرنے پر پتہ چلا کہ مورت فلاں پہاڑی پر مل گئی ہے ——بس اب بھگوان کی بھی مرضی تھی کہ پرانا مندر ڈھا دیا جائے اور بند کا پانی ہر طرف پھیل جائے !! ——

فنکار نے افسانہ میں منگل کو ایک اہم کردار بناکر پیش کیا ہے - جو انہی کسانوں کا بیٹا اور اسی ماحول کا پروردہ ہے لیکن " نئے کسان " کا تصور اب اسے کچھ کرنے پر آمادہ کر رہا ہے ——وہ جانتا ہے کہ گاؤں والوں کی ترقی اسی میں ہے کہ بند ھ کا پانی گاؤں اور علاقہ کو سیراب کرے اور مندر کے ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے جانے میں کوئی ہرج نہیں ! ——اسکی اپنی من پسند لڑکی اب اسکے خیالوں میں بس گئی تھی وہ کچھ کر گزرنا چاہتا تھا :——

" اس رات منگل کو نیند نہیں آئی -کبھی اسکو بند کا دھیان آتا کبھی اس لڑکی کا خیال جس سے وہ شادی کرنا چاہتا تھا -کبھی اپنے نیتا کے گیان بھرے لفظ اور کبھی انکا فکر مند چہرہ یاد آجاتا ——اس کا بس تو نہ چلتا تھا -آخر اس نے سوچا کہ مندر میں جاکر پرارتھنا کرے ۔ شاید بھگوان ہی اسے کوئی راستہ دکھائیں — جس سے دیش کے اتنے بڑے کام کی رکاوٹ ہٹ جائے —— —— مورتی کے دئیے کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی بھگوان

پر پڑ رہی تھی ۔ان کے سندر مکھ پر چنچل ، مدھر معصوم ، مگر شرارت بھری مسکراہٹ کھیل رہی تھی — اور کرشن جی کا بچپن میں گوپیوں کے ساتھ کھیلنا اور مکھن چرانے کی بات یاد آکر ایکدم لگا جیسے مورتی کے چپ ، گم سم ، ہونٹ اس سے کچھ کہہ رہے ہوں — وہ سمجھ گیا کہ بھگوان کیا اشارہ کر رہے ہیں ! ——— ——— اگلی صبح جب ستیہ گرہوں کے مندر کا دروازہ سویرے کھولا ، تو سب یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ مورتی اپنے استھان پر سے غائب ہے ——— اور کسی نے چلا کر کہا :——بھگوان کی مرضی ظاہر ہوگئی ۔" ۱۔

گاؤں کے کسان بند کے پانی سے سیراب ہونے لگتے ہیں ایک دوسرا نیا مندر اونچی پہاڑی پر تیار کیا جاتا ہے اور اس میں بھگوان کی وہی مورتی رکھ دی جاتی ہے ——پرستو رام ، منگل کا پتا اب اپنے بیٹے کی باتوں کو سوچکر خوش نظر آتا ہے۔ اسکی شادی بھی اسکے من پسند لڑکی سے ہوجاتی ہے ——اور گاؤں میں وہی کسان ایک نیا ولولہ ، نئی طاقت اور نئے اعتماد کو مشعل راہ بناکر ترقی کے راستوں پر گامزن ہوجاتے ہیں !! ——— یہ افسانہ ۱۹۵۶ء کا لکھا ہوا ہے ۔ملک تقسیم ہوچکا تھا ۔ مساوات ، تقسیم ہند اور فرقہ وارانہ جارحیت پر خوب افسانے لکھے جاچکے تھے ۔اب

۱۔نیا شوالہ ۔خواجہ احمد عباس (نئی دھرتی نئے انسان) ص ۱۸ ۔ ۱۷

افسانہ نگار ہندوستانی سماج اور معاشرہ کو صنعتی اور مشینی زندگی سے مربوط کرنا چاہتا تھا ۔۔خواجہ احمد عباس نے اسی موضوع کو پیش نظر رکھ کر اس افسانے کی تحقیق کی ۱۱ ۔۔۔

" دو پاتھ" خواجہ احمد عباس کا ایک اور افسانہ ہندوستانی سماج میں اقتصادی بدحال اور اس سے پیش آنے والے رد عمل پر ایک کامیاب کوشش ہے ۔ انسان کی سماجی زندگی ، ۔۔۔۔۔۔اس کے ذاتی نفسیاتی مسائل ، ان کے دور کرنے کی کوشش میں فرد کا مختلف شخصیتوں کے قول و فعل کا اثر اسکی اپنی عملی زندگی پر اس افسانے کی اہم اجزائے ترکیبی ہیں جن سے ملکر کہانی کا تانہ بانہ بناگیا ہے ۔ کہانی کا موضوع " اقتصادی بدحالی اور اسکو دور کرنے کا حل" ہے جس میں ایک سیدھا سادہ ، محنتی اور ایماندار انسان ، سکھا رام گاؤں میں کمائی کا کوئی ذریعہ نہ ملنے کی وجہ سے شہر اس امید پر چلدیتا ہے کہ وہ کماکر اتنا روپیہ جمع کریگا جس سے پھر سے وہ اپنے بیل خرید کر کھیتی کرسکے ۔اور اپنی بیوی ساوتری کے لئے ساتھ چین سے زندگی بسر کرسکے وہ گاؤں چھوڑتے وقت یہ عہد کرتا ہے :۔۔۔

" گاؤں چھوڑتے وقت اس نے وٹھوبا کے مندر میں جاکر اپنی بیوی کے سامنے قسم کھائی تھی کہ اب وہ اس وقت ہی واپس آئیگا جب اسکے ہاتھ میں چار پیسے ہوں گے ۔۔۔۔ تاکہ ساہوکار سے اپنی زمین چھڑالیں ۔۔۔۔اپنے جھونپڑے کی مرمت کرالیں ۔اور ہل جوتنے کے لئے ایک جوڑی کرہا پوری بیل خرید لیں ۔۔۔بس اتنی سی دنیا تھی ۔ان کی دو بیگھہ زمین ایک جوڑی بیل ، ایک

پل ، چھوپڑے کی چار دیواریں اور پھونس کی چھت ،
اور ——— ساوتری !! ——— " ۱۔

ساہوکارانہ نظام کی اس پستی سکھا رام ، اپنا سب کچھ ساہوکار کے حوالہ کرکے بمبئی کی طرف چل دیتا ہے ——— بمبئی میں وہ محنت مزدوری کرتا ہے ۔بوجھ ڈھوتا ہے اور چھ مہینہ میں ساڑھے تین سو روپے جمع کرکے اپنی انٹی میں رکھے ہوئے فٹ پاتھ پر سو رہا ہوتا ہے کہ کوئی چور اسکا روپیہ سوتے میں نکال لیتا ہے ——اسکی آنکھ کھلتی ہے اور روپیہ نہ دیکھ کر یہ بیچارہ ایماندار دیہاتی سارے خوبصورت خواب بھول جاتا ہے —— افسانہ اب شہری زندگی کے ایک نا کام ' اور بد حال کردار کے ذریعہ سے آگے بڑھتا ہے ——یہ کردار بھیکو ! ——— بھیکو ایک شرابی قلّاش شہر میں فٹ پاتھ پر زندگی گزارنے والا فرد ہے ——جس میں کچھ کرنے کی تمنا ، کوئی آرزو ، کوئی مستقبل یہ تمام باتیں اس سے مفقود ہوچکی ہیں ——بھیکو اسکے روپیہ رات کو چراکر غائب ہوجاتا ہے ——جب سکھا رام کو اس بات کا پتہ چلتا ہے تو کئی دن برابر تلاش کرنے کے بعد آخر بھیکو اسکو ایک شراب خانہ میں نشہ میں دھت مل جاتا ہے —— وہ غیظ و غضب کے ساتھ اپنے روپیہ اس سے مانگتا ہے مگر بھیکو تو سوائے چند سکوں کے تمام روپیہ شراب کی نذر کرچکا ہوتا ہے ——اور آخر کار سکھا رام کا ذہن اب اس ماحول کے گرد گھومنے لگتا ہے ۔چوری اور فوری طور پر دولت کا حصول اسکو محنت مزدوری کرکے تھوڑی تھوڑی کمائی کے خیال سے دور کرنے لگتا ہے ۔اور چوری کرکے پیسہ کا حصول اسکی عادت بن جاتی ہے ——تین سال یوں ہی گزر جاتے ہیں وہ کئی

۱۔ دو ہاتھ ۔خواجہ احمد عباس (نئی دھرتی نئے انسان) ص ۱۹۰

بار چوری کرتا ہے -بہت بار پکڑا بھی گیا جیل بھی گیا اور یہاں تک کہ بمبئی کی ہر پولیس اب اسے اچھی طرح پہچان گئی تھی ——وہ بمبئی چھوڑ کر پونہ چلا جاتا ہے اور ایک دن کسی کا پرس غائب کرتے ہوئے وہ جلد ہی ایک ایسی بس میں چڑھ جاتا ہے جو اسے ایک ایسے قصبہ میں لیجاتی ہے جہاں اسکے لئے چوری کرنے کو بہت سی دوکانیں تھیں ——کپڑے کی دکانیں ، زیورات کی دکانیں ——————

سکھا رام وہاں فیصلہ کرتا ہے کہ آنیوالی رات کو وہ آخری بار چوری کرے گا —— اور ضرورت بھر رقم لیکر وہ گاؤں لوٹ جائیگا ——اور پھر ایمانداری کے ساتھ محنت کرکے اپنی بیوی کے ساتھ زندگی گزاریگا ——رات عین چوری کے وقت کسی بھونچال سے سارا قصبہ ، دیواریں اور دوکانیں ٹوٹ پھوٹ کر گرجاتی ہیں اور مکانوں تلے مرد عورت اور بچوں کی لاشیں ہوتی ہیں -یہ بچ جاتا ہے اور جی بھر کر دکانوں سے سامان اٹھالیتا ہے ، سامان کا بوجھ سر پر لئے یہ قصبہ سے نکل رہا ہوتا ہے کہ ایک معصوم بچہ کی رونے کی آواز کسی گری ہوئی دیوار کے نیچے سے آتی ہے اسکے قدم رک جاتے ہیں مگر اسکے لئے بچہ اور سامان کی گٹھری کو ایک ساتھ لے جانا ممکن نہیں ہوتا ہے ——سکھا رام کے اندر پھر وہی بھولا بھالا انسان جاگ اٹھتا ہے -ہمدردی اور محبت اسے مجبور کردیتی ہے اور وہ سامان کی گٹھری کو رکھ کر بچہ کو اپنی گود میں اٹھاکر قصبہ سے باہر چلا دیتا ہے ——————

اس افسانہ میں ایک ہندوستانی انسان اپنے آپ کو کئی بار بدلتا ہے —— ایک زندگی اسکی وہ بھی تھی جب وہ اپنے گاؤں میں خود اپنی محنت کے اناج کو چپ چاپ ساہوکار کے حوالہ کردیتا ہے -اس وقت اس میں مقابلہ کی طاقت نہ تھی -

اپنا حق لینے کی ہمت نہ تھی ——پھر وہی انسان شہر کی طرف رخ کرتا ہے ——
ایک ایسے شہر کی طرف جو اسکے گاؤں کی زندگی سے بالکل مختلف ہے -وہاں بھی
وہ محنت مزدوری کرتا ہے اور اپنی بساط کے مطابق کئی مہینوں میں چند سو روپیہ جمع
کرپاتا ہے ——لیکن اسکے روپیہ کی کوئی چورٹ کرلیتا ہے -اب شہری زندگی کا عکس
اسپر اس زاویہ سے پڑتا ہے جسکا سلسلہ چوز بازی ، عیاری دھوکہ اور لوٹ مار سے جاکر
ملتا ہے ——یہاں ایک دم دولت کا حصول اور فوراً اسکے چلے جانے کا امکان ہے -
یہ راستہ وہ اپنا لیتا ہے ——مگر یہ فعل چونکہ بے برکت ہوتا ہے اس لئے کئی سال
گزر جانے پر بھی وہ خالی ہاتھوں رہتا ہے ——لیکن پھر ایک بار اسی انسان کے
اندر اسکا وہ جذبئہ ہمدردی اور جذبئہ اخوت جاگ اٹھتا ہے جو وہ گزشتہ ۳ سال سے
بھولا بیٹھا تھا ——کہانی میں وہ روشن پہلو جو ۵۰ کے بعد اردو مختصر افسانے
میں ابھرے ہیں وہ ہیں شہری زندگی کا نفسیاتی رد عمل اور اس سے پیدا ہونے والے
مہلک اثرات ا ——یہ افسانہ بھی چونکہ ۰۶۸ میں لکھا گیا ہے اس لئے اس میں
بھی شہری اور دیہاتی زندگی کا ایک گہرا ربط نظر آتا ہے ——اور ایک دیہاتی
کسان اور جاہل گنوار بھی ان آلات اور حالات سے آشنا نظر آتا ہے جو پہلے گاؤں
والوں کے لئے محض ایک خیال خام نظر آتے تھے ——

۵۰ء کے بعد نئے موضوعات کو لئے ہوئے خواجہ احمد عباس کا ایک افسانہ
" یہ بھی تاج محل ہے " ——اس میں "نئے معمار" کی ایک کہانی ہے ، جو اب پہلے
کی طرح کمزور نا تواں نہیں ہے اور نہ اب وہ مضبوط طاقتوں اور جابر حکومت کا احترام
کرتا ہے اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے وہ کبھی پیچھے نہیں ہٹتا ہے ——
یہ افسانہ آزاد ہندوستان میں اپنے باپ دادا کے تعمیری کارناموں کو مد نظر رکھتے

ہوئے فرد کی آزادی اور اسکی خواہش کا احترام کرنے کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔
یہاں ایک معمولی غریب اور کمزور معمار بھی اب دبنے پیچھے رہنے اور اپنے ارادے سے بعض رہنے پر کسی طرح بھی تیار نہیں ہے ——— اشوکا ہوٹل کے آس پاس ان لوگوں کی جھونپڑیاں ڈھادی جاتی ہیں جنھوں نے ہوٹل کی تعمیر کے دوران اپنی جھونپڑیاں بنالی تھیں — دن بھر یہ معمار ہوٹل کی تعمیر میں جٹے رہتے اور شام کو اپنی جھونپڑیوں میں دم لیتے ——— انھیں میں ایک معمار ایسا بھی تھا جس کی بیوی نے سب سے پہلے ہوٹل کے قریب محض اس وجہ سے جھونپڑی ڈالی تھی کہ وہ اپنے شوہر سے زیادہ سے زیادہ وقت قریب رہ سکے ! ———

یہ معمار ہوٹل کی تعمیر میں دن بھر مصروف رہتا اور شام کو جھونپڑی میں آکر بیوی کی قربت میں ساری تھکن دور کرلیتا — ہوٹل جب بنکر تیار ہوگیا تو جھونپڑیوں کو ڈھا دیا گیا — لیکن ایک مزدور ، مہادیو پرشاد نے پھر اپنی جھونپڑی اسی جگہ پر دوبارہ کھڑی کرلی ۔ آٹھ بار اسکی جھونپڑی ڈھائی گئی اور آٹھ بار اس نے پھر کھڑی کرلی ! — نویں بار جب پھر حکومت کے افسران جھونپڑی ڈھانے آئے تو اس نے اپنی کہانی شروع کردی ——— اپنے باپ دادا کے فن کے کارناموں کو بیان کیا اور یہ بھی کہ دیا کہ ان کو تو بے گھر کردیا گیا مگر اب آج یہ نہیں ہوگا تم ڈھانے پر تلے رہو اور میں بنانے پر اڑا رہوں گا !:-

" میری کہانی بہت پرانی ہے ۔ سرکار ، شائد اتنی
پرانی جتنے پرانی چکنی مٹی کے وہ سڈول مٹکے ہیں —
جو ہزاروں برس پہلے میرے کسی دادا پڑ دادا نے

موہن جدارڑ کی کمہاروں کی بستی میں اپنے چکے
کو گھماکر اپنی انگلیوں سے بنائے تھے ۔اور جنکو
آپ کے کسی دادا پر دادا نے کوتوال شہر نے اپنڈنڈا
مار کر توڑ دیا تھا ـــــاور جن کے ٹکڑوں کو بڑی احتیاط
سے جوڑ کر اب ہمارے جن پتھر والے نیشنل میوزیم میں
رکھا ہوا ہے ۔" ۱۔

اس افسانہ میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ طاقتور حکومت اور سرمایہ دار طبقہ روپیہ تو خرچ کرسکتا ہے لیکن کسی بھی تعمیر میں غریبوں اور مزدوروں ہی کی محنت اور انکی فنکاری ہوتی ہے ۔غریب مزدور کے بل بوتے ہی پر کسی اچھی عمارت کا وجود ہوتا ہے ۔پھر اسی غریب طبقہ کو کام نکل جانے کے بعد اس طرح کچل دیا جاتا ہے۔ جیسے ان کی کوئی اہمیت ہی نہیں ـــــآج کا غریب اور مزدور اپنی اہمیت کو سمجھ گیا ہے ـــــاس کے نزدیک کبھی کبھی ایک معمولی سی جھونپڑی کی قدر و قیمت عظیم الشان عمارت سے کہیں زیادہ ہوتی ہے ـــ

" اس شام جب میں کام سے لوٹا تو کیا دیکھتا ہوں میرا
گھر تیار ہوگیا ہے ۔رجی نے آس پاس سے اینٹ پتھر
جمع کرکے ان کی چار دیواریں کھڑی کردی تھیں ا
ان پر نہ جانے کہاں سے پرانے ٹین کی چادریں لاکر
ڈال دی تھیں ـــــسامنے کی زمین کو صاف کرکے گوبر

۱۔یہ بھی تاج محل ہے ۔خواجہ احمد عباس (نئی دھرتی نئے انسان) ص ۱۳۱

موہن جداڑد کی کمہاروں کی بستی میں اپنے چکے
کو گھماکر اپنی انگلیوں سے بنائے تھے -اور جنکو
آپ کے کسی دادا پر دادا نے کوتوال شہر نے اپنے ڈنڈا
مار کر توڑ دیا تھا ———اور جن کے ٹکڑوں کو بڑی احتیاط
سے جوڑ کر اب ہمارے جن پتھر والے نیشنل میوزیم میں
رکھا ہوا ہے -" ۱-

اس افسانہ میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ طاقتور حکومت اور سرمایہ دار طبقہ روپیہ تو خرچ کرسکتا ہے لیکن کسی بھی تعمیر میں غریبوں اور مزدوروں ہی کی محنت اور انکی فنکاری ہوتی ہے -غریب مزدور کے بل بوتے ہی پر کسی اچھی عمارت کا وجود ہوتا ہے -پھر اسی غریب طبقہ کو کام نکل جانے کے بعد اس طرح کچل دیا جاتا ہے- جیسے ان کی کوئی اہمیت ہی نہیں ———آج کا غریب اور مزدور اپنی اہمیت کو سمجھ گیا ہے ———اس کے نزدیک کبھی کبھی ایک معمولی سی جھونپڑی کی قدرو قیمت عظیم الشان عمارت سے کہیں زیادہ ہوتی ہے —

" اس شام جب میں کام سے لوٹا تو کیا دیکھتا ہوں میرا
گھر تیار ہوگیا ہے -رجّو نے آس پاس سے اینٹ پتھر
جمع کرکے ان کی چار دیواریں کھڑی کردی تھیں !
ان پر نہ جانے کہاں سے پرانے ٹین کی چادریں لاکر
ڈال دی تھیں ———سامنے کی زمین کو صاف کرکے گوبر

۱-یہ بھی تاج محل ہے -خواجہ احمد عباس (نئی دھرتی نئے انسان) ص۱۳۱

سے لیپ دیا تھا -چار اینٹوں کے چولھے پر توا
چڑھا ہوا تھا -اور وہ بیٹھی ہوئی میرے لئے روٹیاں
سینک رہی تھی ! ——— اتنی خوشی بھلا کب اور
کسے نصیب ہوئی ہے ، میں نے سوچا ! -" !-

افسانہ کا اگر نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو پتہ چلیگا کہ غریب نفسیاتی طور پر زیادہ جذباتی ، زیادہ مخلص ، اور زیادہ محبت کرنے والا ہوتا ہے کیوں کہ اسکے پاس محبت کا وہ پرخلوص جذبہ ہوتا ہے جسکی بنیاد پر وہ جیتا ہے ——بر خلاف ایک سرمایہ دار کے اس کے پاس تمام مسرتیں عیش و آرام اور خوشیاں پیسے کی رہین منت ہوتی ہیں -سماج میں اپنی اہمیت کو سمجھتا ہے -وہ سماج سے آزادانہ طور پر جینے کا حق مانگتا ہے اور کچی اینٹوں سے بنائے ہوئے گھاس پھوس کے اپنے تاج محل کو منہدم ہوتے ہوئے کسی قیمت پر برداشت نہیں کرسکتا :—

" آٹھ بار آپ نے یہ گھر ڈھایا ہے -آٹھ بار میں نے یہ
گھر بنایا ہے -آپ اسے ڈھانے پر مجبور ہیں اتنا ہی
میں اسے قائم رکھنے پر مجبور ہوں ————
کیوں ؟ مجھے یہ ضد ، یہ جنون کیوں ہے ؟ میں
دوسری جگہ گھر لینے پر تیار کیوں نہیں ہوتی ؟ آپ
کی خاموشی میں یہ سوال گونج رہا ہے - " کیا آپ ابھی
آپ نہیں سمجھے ؟ میں سمجھاتا ہوں " یہ اینٹوں
پتھروں کی چار دیواریں اور ٹین کی چھت نہیں ہے —

یہ رجن کا تاج محل ہے -یہ وہ تاج محل ہے جسے
ہزاروں برسوں سے ہم بناتے آرہے ہیں اور آپ ڈھاتے
آرہے ہیں ، سرکار ! مجبور آپ بھی ہیں اور مجبور
میں بھی ہوں !-" ۱-

آزادی کے بعد جو سماجی اور سیاسی تبدیلیاں اس ملک میں ہوئیں اسکا اثر ہماری ذاتی اور خارجی دنیا میں کس طور پر پڑا اسکا اظہار خواجہ احمد عباس کے مذکورہ افسانوں میں ملتا ہے -انھوں نے ملک کے ترقیاتی منصوبوں اور سماج کے تہذیبی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے ——

——— xxx ———

———

۱-یہ بھی تاج محل ہے -خواجہ احمد عباس (نئی دھرتی نئے انسان) ص ۱۳۹ - ۱۳۸

علامتی افسانہ ۱۱ —— (نئے موضوعات کی روشنی میں)

علامتی یا تجریدی افسانے کے موضوعات بھی آج کی پیداوار ہیں کیوں کہ آج کا معاشرہ ایسے دور سے گزر رہا ہے کہ ہر شخص اپنے روز مرہ کے کام کرتے وقت اپنے چہرے پر بے فکری اور اطمینان کا بظاہر نقاب چڑھائے رہتا ہے۔ اور یہ آج کے انسان کی مجبوری ہے کہ وہ اس لگاتار خوشی بکھری زندگی کی طرف سے اپنی آنکھیں مکمل طور پر بند نہیں رکھ سکتا —— نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دوسرے انسانوں کی طرح افسانہ نگار ادیب بھی اندر ہی اندر دھیرے دھیرے زیادہ سے زیادہ خانوں میں تقسیم ہوتا جارہا ہے آج کا عام انسان پہلے کے مقابلہ میں زیادہ سمجھدار ۰ زیادہ چالاک ۰ اور زیادہ مصروف ہوچکا ہے۔ انسانی رشتے ذاتی ضروریات اور باہمی فوائد کے رو برو پروان چڑھتے ہیں —— سائنسی تہذیب اور مشینی زندگی نے لوگوں کے دلوں کو بہت حد تک مشکوک اور دو رخی طبیعت کا غماز بنادیا ہے ۰ جسکی وجہ سے جذبہ کا فقدان اور روائتی اخلاق کی کمی معاشرہ کی عام ریت بن چکی ہے اور مربوط ذہن خود کو منتشر اور غیر مطمئن پاکر بہت کچھ سوچنے لگتا ہے اور سوچ کا یہی دائرہ اپنے احاطہ میں بہت سے فکری اجزاء جمع کرکے اسکو اپنے تئیں برتنے ۰ پرکھنے اور استعمال کرنے لگتا ہے اور یہ تمام کی تمام فکری عناصر کبھی تنگ دستی و تنگ دامنی کبھی روزگار کی تلاش میں ناکام ہوکر کبھی بغض و عناد کی گھناؤنی تصویر دیکھ کر اور کبھی حق تلفی کو ہوتا ہوا محسوس کرکے اپنے دائرہ سے باہر نکل آتے ہیں اور چونکہ یہ باتیں عام انسان کے ساتھ درپیش ہیں اس لئے اسے سمجھنے یا سمجھانے کے لئے ہلکے پھلکے اشارے اور کنائے یا کبھی کبھی محض نشانات ہی کے ذریعہ پیش کردیا جاتا ہے ۔ وہ اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی بد نظمی ۰

بد ضوانی ، انتشار اور پراگندگی کو دیکھتا ہے -کبھی وہ بہت تاریکی میں ہلکی سی روشنی میں رات بھر مارہ مارہ گھومتا رہتا ہے اور آخر میں ناکام و نا مراد قید خانہ کی ایسی سلاخوں میں بند کردیا جاتا ہے -اور کبھی ایسابھی ہوتا ہے کہ خود ایک زندہ جیتا جاگتا اور تمام ہوش و ہواس سے منظم انسان خود کو پتھروں کے شہر میں مردہ بے جان مورتیوں کے گرد ایک لاش تصویر کرنے لگتا ہے وہ اپنی بے بس ، بے لغا عتی اور لایعنیت کو محسوس کرتا ہے -اور وقت کو اپنے اندر ہی اندر سمٹتا ہوا محسوس کرتا ہے ایسے معاشرہ اور ماحول میں پیدا ہونے والے اسباب ہی آج کے علامتی افسانوں کے موضوعات ہیں !! ــــــــــعلامتی افسانوں کے موضوعات در اصل عملی زندگی سے کم اور انسانی ذہن سے زیادہ قریب نظر آتے ہیں ـــــ اور یہ ہی وجہ ہے کہ ان افسانوں میں عمل کے بجائے فکری مطالعہ زیادہ واضح طور پر پیش کیا جاتا ہے - بہت زیادہ لمبی چوڑی داستانوں اور تمہید کی اس میں ضرورت نہیں ہوتی صرف مطلب کی بات بیان کی جاتی ہے -کیوں کہ آج کا قاری بہت زیادہ مصروف اور سمجھدار ہے وہ صرف کام کی بات مختصر طور پر سننا پسند کرتا ہے -اور اسکے لئے اگر صرف اشارے سے بھی افسانہ میں کام لیا جاتا ہے تو کافی ہوتا ہے ــــاور یہ ہی وجہ ہے کہ اگر ایک طرف افسانہ کی تاریخ میں ۵۰ ءکے بعد کرشن چندر ، منٹو ، بیدی ایک تکون کی حیثیت رکھتے ہیں تو دوسری سخت علامتی افسانہ نگاروں میں مین را ، جوگیندر پال اور سریندر پرکاش نے بھی اپنے موضوعات کی بہتوں کا صحیح تعین کیا ہے ــــ

جوگیندر پال علامتی افسانہ نگاروں میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں -ان کے اب تک تین مجموعہ منظر عام پر آچکے ہیں ، رسائی ، لیکن ، اور افسانوں کا ایک مجموعہ سکوئیں ـــــــــان مجموعوں کی تمام کہانیوں میں علامت کے ذریعہ جوگیندر پال نے خود اپنی سوچ اور فکر کا اظہار کیا ہے -ان کے افسانوں کے موضوعات انسانی ذہن کی

ایسی تخیلات ہیں جو وہ اپنے دور میں دیکھتا ، سنتا اور پرکھتا ہے ، پھر سوچ کے محور پر انہیں اپنی فکر کے قدموں کے ذریعے آہستہ آہستہ جس طرح چاہتا ہے حرکت دینے لگتا ہے ۔لیکن بسا اوقات ذہن کی یہی کارفرمائی فرد کو متواتر سوچتے رہنے پر آمادہ رکھتی ہے اور اسکی بنیادی وجہ ان کی کہانیوں میں موجودہ دور کا وہ دور خاپن ہے جس کا نقاب عام طور پر انسانی چہرے پر پڑا ہوا نظر آتا ہے ——— یہ افسانہ نگار اس نقاب کو اتار پھینکنا چاہتا ہے مگر ناکام ہوکر پھر خود بھی ایک ایسا ہی نقاب اپنے ہی چہرے پر چڑھاکر دنیا کو اسی نظر سے دیکھنے لگتا ہے ۔جب کہ وہ یہ سب کچھ دل اور رضا مندی سے نہیں کرتا بلکہ اس کے آگے مغلوب ہوکر شکست کا اقرار کرلیتا ہے ———ان کی کہانیوں میں عام طور پر کردار سوچتے اور غور کرتے ہوئے ایک فلسفی کی طرح کسی حل کی تلاش میں سرگرداں و پریشان نظر آتے ہیں اور کہانی کے اختتام تک تھک ہار کر پھر اسی نقطہ نظر آغاز پر واپس چلے جاتے ہیں ۔ جہاں سے انہوں نے سوچنا شروع کیا تھا کیوں کہ سوچ کا یہ عمل کردار کو بہت جلد تھکا دیتا ہے ———

جوگیندر پال اپنی ایک کہانی " چہار درویش " کے ذریعہ ایک ایسے موضوع کو پیش کرتے ہیں جس میں ایک جاندار (انسان) کا رشتہ کسی بے جان (درخت) سے اتنا ہی قریب تر ہے جیسا کہ خود ایک درخت سے دوسرے درخت کا ! ——— انہوں نے اپنے اس افسانہ میں جھیل ، درخت ، جنگل ، برف عورت ، اور پتوں کو ایسی علامت بناکر پیش کیا ہے جو علامت ہونے کے باوجود علامت نہیں لگتی ہیں ان کے استعمال کے ذریعہ افسانہ نگار نے اپنے ایک خیال کے پیش نظر پہلے تو آدمی اور درخت کو صرف اس لحاظ سے الگ الگ ثابت کیا ہے کہ درخت صرف ایک ہی جگہ کھڑے کھڑے بڑھ سکتا ہے

ہوتا ہوسکتا ہے اور پھر آخر کار اس کے تمام پتہ جھڑ کر اسکو بے جان بناد یتے ہیں ——
لیکن آدمی چل پھر بھی سکتا ہے ، کہ اور سن بھی سکتا ہے اور سوچ سمجھکر کسی فیصلہ
کے قابل بھی ہوتا ہے ——پھر آگے چل کر انسان کی یہ تمام حرکات ایسی بے مقصد
اور بیکار ثابت ہونے لگتی ہیں جس سے اسکی انسانی شناخت بکسی مفقود ہوچکی ہوتی ہے۔
اور بارہا انسان یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ خود اس میں اور ایک درخت میں کوئی
فرق نہیں ——

" ہاں میں کیا سوچ رہا ہوں ؟ ! ——سچ بات تو یہ ہے کہ
میں کچھ بھی نہیں سوچ رہا —— ہاں ، سوچ رہے ہوتے تو
درخت کیوں ہوتے ؟ ! ——ارے ہاں ! ، مجھے یاد آگیا ،
جب میں درخت نہ تھا ، تو آدمی تھا ، ——ڈوبتی ہوئی
دھرتی کی ساری سوچوں کو تھام تھام کر میں اسقدر خالی ہوگیا
کہ درخت ہوگیا ——
تو پھر ہم سبھی آدمی ہوں گے ؟ ! مگر اب آدمی سے درخت
ہوگئے ہیں ——اور بول نہیں سکتے ، لیکن بول لیتے ہیں ،
——اور دیکھ نہیں سکتے ، لیکن دیکھ لیتے ہیں اور
سوچ نہیں سکتے لیکن سوچ لیتے ہیں !! ——
نہیں ، ہم سوچتے نہیں ، ——کیوں کہ ہماری ساری سوچیں
ہماری جڑوں میں پیوست ہوچکی ہیں ——ہاں ! اسی لئے ہم
ہر سال جھڑ جاتے ہیں !! —— "۱۔

۱۔ چہار درویش ۔جوگیندر پال ۔صفحہ ۵۱ ، " لیکن " جولائی ، ۱۹۷۷ء
نظامی پریس لکھنؤ ۔

سوچنے اور نہ سوچنے کے اس عمل سے لمحہ بھر کے لئے یہ فرضی طور پر ثابت تو کیا جاسکتا ہے کہ انسان اور درخت میں یہی بنیادی فرق ہے ۔پھر تھوڑی دیر بعد افسانہ نگار اپنے دور کے اس المیہ کو خود اپنے اوپر طاری کرکے یہ کہنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ آج کا انسان بھی درخت کی طرح وہ سب کچھ نہیں کرپاتا ہے جو کچھ وہ سوچ کر یا اپنی فکر کے ذریعہ کرنا چاہتا ہے ۔کیوں کہ فکر کا اظہار عمل کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور اس دور میں انسان وہ سب کچھ نہیں کرپاتا ہے جو کچھ کہ وہ سوچ کر کرنا چاہتا ہے اس لئے درخت ——— درخت بھی سوچتے ہیں ، بات کرتے ہیں ، اور دیکھ سکتے ہیں لیکن ان کے اس عمل کا اظہار دوسرے پر نہیں ہوپاتا ہے اس لئےانکو درخت کہکر بے جان اور سوچنے ، بولنے اور دیکھنے کے عمل سے عاری ثابت کردیا گیا ہے ——— اور فکر یا سوچ کا عمل اظہار نہ ہوپاتا ، یہ کسی ایک فرد ، یا ایک انسان کا المیہ نہیں بلکہ سارا کا سارا سماج اس مجبوری اور گھٹن کا شکار ہے ۔ فرق صرف ہر ایک کی سوچ سوچ کا ہے کوئی اس المیہ کو محسوس کرلیتا ہے اور کوئی محسوس نہیں کرپاتا ۔ اسی بات کا اظہار افسانہ نگار نے اپنی کہانی میں اس طرح کیا ہے ۔

" کاش ہم آدمی ہوتے ! ——لیکن میں تو آدمی ہی ہوں ؟
کیا تم خوبصورتی کے پیچھے جاسکتے ہو ! ؟ نہیں ——
یا اسے آواز دیکر ٹھہراسکتے ہو ؟ ! ———نہیں ! ———
یا وہ خود ، آپ ہی تمہارے عشق میں گرفتار ہوکر ٹھہرنے
کا فیصلہ کرے تو محبت سے اپنی جگہ سے تین چار انچ بھی
اسکی جانب سرک سکتے ہو ؟ ———نہیں ! ———
تو پھر اپنے ذاتی تجربات کی بنا پر میں تمہیں بتارہا ہوں کہ

تم بھی ہمارے مانند درخت پر ۱۱ ——— تجربہ تمہارا
ہے ، اور بات میری ، پھر میں تمہیں صحیح کیسے مان لوں ؟ ۱
——— نہیں ، ——— مجھے اپنے آپ کو منوانا نہیں ہے ،
مجھے صرف اپنی بات کرنی ہے — ہاں اپنے آپ کو سنوانا
مقصود ہو تو اصل بات سمجھ میں نہ آئے تو ہمارے بس صرف اس
لئے چلتے ہیں کہ خالی ہوتے ہیں ۱۱۱ ۔" ۱۔

سارا افسانہ صرف اس موضوع کے محور پر گردش کرتا رہتا ہے کہ چونکہ آج کے نظام میں ایک جمود طاری ہوگیا ہے بالکل اسی طرح جس طرح کہ جنگلوں میں آس پاس برف جمی ہوتی ہے ، اور درخت قریب ہی کھڑے دیکھا کرتے ہیں ان میں اتنی صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے کسی عمل کی گرمی کے ذریعہ اس جمود کو پگھلا سکیں ——— اور یہ جمود اسی وقت پگھل سکتا ہے جب کوئی اپنے عمل اور جہد پیہم کی گرمی سے ان میں داخل ہوجائے بدلے وہ خود کسی پہنائی میں گم ہوجائے ۱۱ ———

اس خیال کا اظہار جوگیندر پال نے اس افسانہ کے مندرجہ ذیل اقتباس کے ذریعہ کیا ہے :-

" گھنے سرما کی اس شام کو جھیل کی جھیل برف پڑی تھی
اور یہ ساری سفیدی زندگی کے ہر رنگ سے بے داغ تھی ۔
اور میں ٹھٹھر ٹھٹھر کر اپنی جڑوں سے چوٹی پر آپہنچا تھا ——
——— اور سوچ رہا تھا کہ اب چوٹی سے نکل کر کہاں پناہ لوں ۱۱ ——
اس وقت ہم سب کہاں تھے ؟؟ ۱ ——— تم سب شاید سردی سے

۱۔ چہار درویش (لیکن) ۔ جوگیند پال ۔ جولائی ۱۹۷۷ء ص ۲۹ ۔ نظامی پریس لکھنؤ۔

بے ہوش ہوچکے تھے ۔ میں نے تمہیں بار بار پکارا ۔ لیکن
ہر بار خود آپ ہی اپنی آواز کو سنکر جواب دیا ۔ کیوں بھئی
شور کیوں مچا رہے ہو ؟ لیکن ٹھہرو ۔ اس لمحہ کی بات پھر
رہ جائیگی ——— ہوا یہ کہ اچانک میں نے دیکھا کہ جھیل کی برفیلی
سطح پر ایک مرد اور ایک عورت ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ کر وارفتہ
ہوتے جارہے ہیں اور انہیں سردی کی قطعاً پروا نہیں ۔ ———
بلکہ سردی وہاں سے پرے کھسکنے لگی ہے ان کے جسموں کے
نیچے برف نے اپنا آپ چھوڑ دیا ہے اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے
وہ دونوں نیچے دھنس کر نا معلوم کہاں چلے گئے ۔ مگر مجھے
یقین ہے کہ وہ جہاں جہاں بھی چھو گئے ہوں گے برف وہاں
وہاں چٹخ کر پانی پانی ہوگئی ——————
——— انکا یہ عمل تمام سرما جاری رہتا ہے اور ساری برف پگھل
جاتی ہے ——— " ۱۔

اس اقتباس میں مرد اور عورت کی حرکات کا استعمال علامت کے طور پر اس طرح پیش کیا گیا ہے ۔ کہ چونکہ ان کے اندر کچھ کر گزرنے کا مخلص جذبہ تھا اور اس جذبہ کے تحت انہوں نے سرد ۔ برفیلی چوٹیوں پر بھی اپنا عمل جاری رکھا جس کے نتیجہ میں وہاں نازک حرارت کے ذریعہ جمود ختم ہوگیا ——————— یہ حرارت چونکہ باقی ماندہ لوگوں میں نہیں تھی اس وجہ سے وہ درخت ہے ۔ موسم سرما میں ٹھٹھر رہے تھے اور شائد اس طرح منجمد ہوجاتے لیکن کسی نے ایسے ہی موسم میں اپنے عمل اور جذبہ کی بنا پر اس سرد موسم میں

چہار درویش (لیکن) ۔ جوگیندر پال ۔ ص ۴۹ ۔ جولائی / ۱۹۷۷ء ، نظامی پریس ، لکھنؤ ۔

بھی حرارت پیوست کرتی اور ساری کی ساری برف ٹوٹ ٹوٹ کر ڈھیر ہونے لگی ! ——

مصنف " لمحہ " کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے خود اپنی ذات میں سارے سماج کو سمیٹے ہوئے اپنے آپ سے ہمکلام ہوکر کسی ایک لمحہ میں بیتا ہوا یہ واقعہ سناتا ہے ——یہ لمحہ کسی زمانے کا بھی ہوسکتا ہے ، ایک ہزار سال پہلے کا بھی یا کچھ بعد کا بھی ، یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ لمحہ ، ابھی اسی ، وقت کا ہو !! — ——یعنی کچھ کر گزرنے کے لئے کوئی بھی لمحہ کافی ہے اور سوچتے رہنے کے لئے ایک مدت پڑی ہے ——

اسی طرح یہ افسانہ اسی سوچ پر آکر ختم ہوجاتا ہے ، کہ واقعی آدمی اور درخت ایک ہیں یا دونوں میں کوئی فرق بھی ہے ، اور یہ خیال صرف کسی ایک فرد کا ہے یا تمام ذہنوں میں مشترک ہے ؟؟ ——

" پتہ نہیں میں بول رہا ہوں یا تم ؟ ! ہاں ! یا ہم سب——
ہاں ، یا وہ بھی ، جو ہم سب میں نہیں ؟ ! نہیں——
وہ دیکھ ہمارا سایہ پانی میں ڈوبا ہوا ہے مگر ہم یہاں اپنی
جگہ پر کھڑے ہوئے ہیں ! ہاں ! ——نہیں ——نہیں ——
ہم وہاں پانی میں ڈوبے ہوئے ہیں اور یہاں ہمارا سایہ ہے !! "[۱]

جوگیندر پال کے مجموعہ " لیکن " میں اور بھی دوسرے افسانے ہیں جو قابل ذکر تو ہیں مگر ان میں سے اکثر کہانیوں کا تانا بانا محض خود کلامی اور سوچ کی ایک ایسی بازگشت پر مبنی ہے جس میں مختلف جملوں کی بار بار تکرار سنائی دیتی ہے

۱۔چہار درویش (لیکن) جوگیندر پال ۔ص ۵۸ ، جولائی / ۱۹۷۷ء ۔نظامی پریس لکھنؤ۔

اور افسانہ نگار خود ایک کردار بنکر اپنے دور کے اس منتشر ذہن کو ٹٹولتا ہوا نظر آتا ہے جس میں کہ آج کا گھرایا ہوا انسان خود سے اپنی سیدھی باتیں کرنے میں مصروف ہے ۔آج کا انسان اور اسکی نفسیاتی کیفیت کا الجھاؤ ہی کم و بیش تمام افسانوں کے موضوعات رہے ہیں " لیکن " کی اکثر کہانیوں میں محض اپنے ذہنی خلفشار کے سبب آبادی میں بھی جنگل کا سا سما پیش کرتی ہیں اور جان دار اور بے جان کے درمیان جو حدّ فاصل مقرر ہے اسکو توڑ کر دونوں کے فرق کو مٹا دینے کا احساس پیش پیش نظر آتا ہے ——

اس کے علاوہ جوگیندر پال کا ایک اور اہم مجموعہ "رسائی" ہے جو تجریدی افسانوں کی ایک اچھی مثال ہے ۔پروفیسر محمد حسن نے " رسائی " کے افسانوں پر اپنا اظہار خیال کرتے ہوئے کہا ہے :-

" جوگیندر پال ان اہم چند افسانہ نگاروں میں ہے جو پچھلے دس سال میں بہت نمایاں ہوئے ہیں ، لیکن جو پیکھاپن ، کیفیت تراش و خراش اور بلاغت ان کے افسانوں میں ہیں وہ ان کے رسائی کے افسانوں میں نہیں ۱۱۔" ۱۔

جوگیندر پال کے افسانوں کا مجموعہ " سلوشن " ۱۹۷۵ء میں شائع ہوچکا ہے جس میں انھوں نے ۱۹۲ (ایک سو چھیانوے) نہایت ہی اچھوتے اور مختصر ترین افسانہ لکھ کر منٹو کے " حاشیہ " کی طرح ایک تجربہ کیا ہے —— جسکا نام انھوں نے افسانے کے بجائے افسانچے رکھ کر ان کے اختصار کی طرف بھی اشارہ کیا ہے ——

۱۔ساتویں دہائی کا افسانہ ۔محمد حسن ۔ص ۱۲۲ (عصری ادب) دسمبر ۱۹۷۰ء
(ادارۂ تصنیف ، دہلی ۔)

خود جوگیندر پال نے اپنے ان افسانچوں کے بارے میں لکھا ہے :-

" کسی تصویر کی جامعیت کی اساس محض اس بات پر نہیں ہوتی کہ مصور کے نقوش دیو قامت ہیں اور نہ ہی کوئی ادبی تحریر صرف اپنی طوالت کے بدولت بر گو ہوتی ہے ، در اصل نقش ہی جامع اور جاندار ہوتا ہے ، جس کے تخیّل کی وضع تخلیق کار کے ذہن میں ظاہر متناسب ہو ۱۱ ـــــــ

اس کے علاوہ اپنی افسانوی فکر کے یہ ننھے منے پیمانے پیش کرنے میں مجھے اس لئے بھی باک نہیں کہ بعض اوقات ایک لمحہ کا اختصار اپنے پھڑ پھڑاتے پروں کے نیچے ایک پورا دور چھپائے ہوتا ہے ـــ

انکا ایک مختصر ترین افسانہ یا افسانچہ " بے چارہ " ہے - جسکا موضوع اشتراکیت کی آواز اٹھانے والے دانشوروں کی ناکامی پر ایک کامیاب اظہار ہے ـــــ قدروں کے بکھرے اور ٹوٹنے سے نئی سمتیں تو ضرور مقرر کردی جاتی ہیں مگر انسانی ذہن میں پلنے والی وہ ملعون حرص اور دولت کا یک طرف استعمال آج کے دور میں بھی بدلا نہیں ہے ـــ اور یہ احساس اسقدر مضبوط ہوچکا ہے کہ بعض کے لئے خوشی ، آرام اور مطمئین زندگی کا تصور بھی ایک مضحکہ خیز بات معلوم ہوتی ہے - اور جب کبھی کوئی ان سے یہ کہتا ہے کہ اچھے انسان کی پہچان یہ ہے کہ وہ اچھا کھائے پہنے ، صاف ستھرا رہے اور ہوادار مکان میں قیام کرے تو یہ آواز ان لوگوں کے انکی شخصیت کا مذاق اڑاتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور ایسے لوگ یہ آوازیں سنکر یا تو چڑھ جاتے ہیں اور یا کسی نا سمجھ کی بات سنکر ان سنی کردیتے ہیں ـــ

۱- پہلا لفظ - جوگیندر پال - ص ۵ - ۱۹۷۵ء ، اردو بازار ناشر لاجپت رائے ، دہلی -

یہ افسانہ جس کے پڑھنے میں قاری کو پندرہ سیکنڈ بھی نہ لگتے ہوں گے ، مگر ایک پوری صدی کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے ۔ ایک ایسی صدی کو ، ایسے دور کو بلکہ ایک ایسے سماج اور معاشرہ کو جسکا ایک غریب فرد اپنی مفلوک الحالی کو دور کرنے سے قاصر ہوچکا ہے مگر اس کے باوجود اپنی " انا " کو مجروح ہوتے ہوئے کسی قیمت پر برداشت نہیں کرسکتا ـــــ وہ غریب انسان تکلیف دہ زندگی تو گزار سکتا ہے مگر ایسے لوگوں کو " اچھے لوگ " کہنے پر کسی طرح بھی راضی نہیں جو اچھا کپڑا پہنکر ، شاندار غذا کھاکر اور ہوا دار مکانوں میں رہکر اچھے لوگ کہلاتے ہیں ـــــ

اسی موضوع کو افسانہ نگار نے اپنے اس افسانچہ میں اس طرح کہا ہے :-

" مفلوک الحال والدین کے پاس بیٹھا بچہ اپنے اسکول کورس کی کتاب پڑھ رہا تھا ـــــ اچھے لوگ ہمیشہ اچھی خوراک کھاتے ہیں ، اجلے کپڑے پہنتے ہیں ، پوادار مکانات میں رہتے ہیں " بکواس بند کرو " ۔ اس کے مفلس باپ سے رہا نہ گیا ! ـــــ بگڑتے کیوں ہو ؟ ! ـ لڑکے کی ماں نے اپنے شوہر کو سمجھایا ! ـــــ بچہ ہے ۔ بیچارہ ! ! ـــــ " ۱ ۔

ان چھوٹے افسانوں کے موضوعات عام طور پر ہمارے آج کے معاشرہ کی وہ چھوٹی چھوٹی باتیں اور روایات ہیں جن میں انسان پل رہا ہے اور اب انکی برائیوں کی طرف نظر بھی نہیں پڑتی ہے اور سارا کا سارا نظام اس بد امنی میں کچھ اس طرح مبتلا ہوچکا ہے کہ فوری طور پر مفر بھی آسان نظر نہیں آتا ہے ـــــ

---

۱ ۔ بے چارہ ۔ جوگیندر پال ۔ ص ۱۷ ۔ (سلوشیں) ۱۹۷۵ء لاجپت رائے سینٹر ، دہلی ۔

جوگیندر پال نے انہیں معمولی معمولی باتوں کو غور سے دیکھا ،
محسوس کیا ، اور پھر طنز کے لطیف پیرایہ اظہار کے ذریعہ انتہائی مختصر الفاظ
میں لکھ دیا ہے۔

نئی نسل کے ایک اور افسانہ نگار سریندر پرکاش ہیں ۱۱ — جنکا نام
۱۹۵۰ء کے بعد کے لکھنے والوں میں قابل ذکر ہے — ان کے افسانوں کا کینوس پرانی
اور نئی روایت کی تمام تصویروں کو ساتھ ساتھ لئے آجکل کی سیدھی سادھی عام فہم
زبان کے ذریعہ پھیلتا جاتا ہے ۔ اور وہ ایک ایسے موضوع کو پیش نظر رکھ کر کہانی کا پلاٹ
تیار کرتے ہیں جس میں بنیادی عناصر قدیم اور جدید تہذیب میں مشترکہ طور پر ایک
جیسے معلوم پڑتے ہیں ۔ — بعض علامتوں کا استعمال ، زندگی کے مختلف شعبوں
کی نشاندہی ان کے یہاں ساتھ ساتھ ظاہر کی جاتی ہے اس طرح کہ قاری دور جدید کے
معاشی نظام پر نظر رکھتے ہوئے ماضی کے ماحول سے بھی باخبر رہے —
سریندر پرکاش نے اپنے اکثر افسانوں میں استعارتی پیرایہ اظہار تحریر اپنایا ہے ، اور
بڑے مناسب طور پر انہوں نے سمندر-وادی ، آگ ، سانپ اور دیمارک قسم کے دیو مالاؤں
کے قصہ سناکر جدید نسل کے ذہن میں ابھرنے والے سوالات اور نہ ختم ہونے والی
الجھنوں کا انکشاف کیا ہے — ان کی کہانیوں کے موضوعات عموماً ان کے باطنی تجربات
کا پیش خیمہ ہوتے ہیں — جس میں وہ اس عقیدہ کو پیش نظر رکھتے ہیں کہ ہمارے ذہن کرب
اور اداسیوں کا سبب ہمارے ہی کئے ہوئے کاموں کا پرتو ہوتے ہیں ۔ انسان ، خواہ وہ آج
کا ہو یا ماضی کے کسی زمانے کا ہو ظلمی شعوری طور پر یا غیر شعوری طور ضرور کرتا ہے
اور ایسا کرنے پر اس کے اعمال کا صلہ خارجی طور کسی نہ کسی صورت میں اس کے سامنے

آتا ہے جو ذہنی کرب اور اداسی کا سبب بنتا ہے ۔اس وقت انسان گزری ہوئی کسی حسین یاد کے سہارے تھوڑی دیر کے لئے ہنس تو ضرور سکتا ہے لیکن اسکی یہ ہنسی دھام اختیار نہیں کرپاتی ۔انسانی رشتوں کا آپس میں تعلق سماجی طور پر تو ضرور تسلیم کرلیا جاتا ہے مگر ان کے اندر ربط قائم نہیں ہوپاتا اور اسکی وجہ دو ذہنوں کی نا ہم آہنگی ہوتی ہے اور سوچنے بقیہ زندگی کو برتنے کا طریقہ جدا ہوتے ہیں ۔جسکا نتیجہ ایک طویل گہری اور خاموش اداسی ہوتی ہے کسی سمندر ، کسی وادی ، یا کسی پہاڑ کی طرح ۔

" پوسٹر " سریندر پرکاش کی ایک ایسی کہانی ہے جس میں انہوں نے انسانی رشتوں ، خصوصاً شوہر اور بیوی کی ایک ایسی بے تعلق زندگی کی طرف علامتی پیرائیہ اظہار کے ذریعہ یہ واضح کرنا چاہا ہے کہ یہ رشتہ بسا اوقات کسی ایسے نامعلوم اور حد درجہ قابل فہم تعلق سے منسلک رہتا ہے جسے بہر صورت کسی نہ کسی سطح پر انتہائی وابستہ اور قریب ترین رشتہ تسلیم کرنا پڑتا ہے ـــــاور یہی حد درجہ قریب ترین رشتہ خارجی طور شہایت ہی بے ربط بے آہنگ نظر آتا ہے ـــــ

افسانہ اس خیال سے شروع ہوتا ہے ـــــافسانہ نگار ایک کردار میں اپنی ماں کا کوئی واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ زندگی میں اس نے کبھی ماں کو پتاجی سے محبت سے بات کرتے ہوئے نہیں دیکھا اور ہر وقت یہی کہتے ہوئے سنا کہ اسکا پتی مر کیوں نہیں جاتا ـــــلیکن جب سچ مچ اسکی ماں کو یہ پتہ چلتا ہے کہ اسکا شوہر چل بسا ہے تو ساری محبت اسکے اندر غور کر آتی ہے اور وہ اپنے آپ کو شوہر کے بغیر غیر محفوظ اور اکیلی محسوس کرنے لگتی ہے ۔

پھر یہی کردار اپنی محبت کا ایک واقعہ یاد کرنے لگتا ہے ۔کسی زمانہ میں

جب وہ کالج میں پڑھا کرتا تھا تو پریم ودا سے وہ محبت کرتا تھا یہ دونوں ایک مدت تک ایک دوسرے کو چاہتے رہے تھے لیکن اچانک اُس شہر کو چھوڑ کر پریم ودا اپنے باپ کے ساتھ ہندوستان چلی آتی ہے اور عشق کی ساری داستانیں وہیں پر ختم ہوجاتی ہیں ۔افسانہ میں " میں" کا کردار پھر اپنے گھر ماں بیوی اور بچوں میں زندگی بسر کرنے لگتا ہے لیکن ایک مدت کے بعد کسی جگہ ایک پوسٹر دیکھ کر اسے پھر پریم ودا کا چہرہ یاد آجاتا ہے اور آخر کار جب ایک مکان کے اندر وہ پہنچتا ہے تو وہی پریم ودا ، مسٹر گوتم کی بیوی کی شکل میں اسے نظر آتی ہے ——— یہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں اور پرانی محبت عود کر آتی ہے ۔پریم ودا اپنے شوہر گوتم کے جذبات کا احترام کئے بغیر ہی اپنے عاشق کے ساتھ پھر محبت بھری باتیں دہرانے لگتی ہے اور دونوں ایک دوسرے میں اپنی اپنی خوشیاں دیکھنے لگتے ہیں ۔کہانی کا مرکزی کردار اپنی بیوی بچوں سے بے خبر پریم دوا کے عشق میں الجھا ہوا ہوتا ہے اور پریم دوا اپنے شوہر سے بے خبر اپنے عاشق " نیم چھی " کو خوش کرنے میں مگن تھی ——

سارا افسانہ ، بیچ بیچ سے فلش بیک کے سہارے پوری کہانی بیان کرتا رہا ہے اور اختتام اس طرح ہوتا ہے کہ پریم ودا اچانک اپنا ذہنی توازن کھوکر پچھلی تمام باتیں بھول جاتی ہے " نیم چھی " کو بھی اب وہ نہیں پہچان سکتی ۔اسکی آنکھوں کے سامنے رامائین کی کتاب کھلی ہوئی ہے اور اسکا شوہر گوتم اسکی رفاقت میں اسکا ساتھ دے رہا ہے ——

ایک جگہ پر افسانہ نگار عورت کے رشتہ پر کسی پر بیچ گتھی کو نہ سلجھا پاکر خود سے سوال کرتا ہے :-

" میرے گرد سب عورتیں ہی عورتیں ہیں ۔میری ماں ، میری بچی ،

اور میری بیوی ، میں کسی کو بھی نہیں سمجھ پارہا ہوں ۔
پریم دوا نے مجھے اندھا کردیا ہے ۔میں کسی کو دیکھ نہیں
سکتا ۔ میرے کان میرے ہیں ، کسی بات کو سن نہیں سکتا ۔ا ا "۱۔

اور افسانہ بس اسی احساس کے ساتھ ختم ہوجاتا ہے کہ بسا اوقات عورت اور مرد میں ذہنی مطابقت نہ ہونے کے باوجود بھی رشتوں کا احترام کرنا پڑتا ہے کیوں کہ جذباتی تعلق کبھی ابدیت اختیار نہیں کرپاتا ۔۔۔علامتی افسانے کی مختصر سی تاریخ میں سریندر پرکاش کا مشہور افسانہ ، " دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم " اپنے ڈرامائی پیچ و خم ، اور "شعور کی رَو" کی تکنیک سے مرصع اور مزین بہت حد تک قابل تعریف ہے ۔۔۔۔اس میں افسانہ نگار نے خود اپنی ہی چیزوں کے گرد گھرا ہوا اپنے آپ کو اجنبی ، کمزور ، نحیف اور بے سہارا سا محسوس کیا ہے ۔افسانہ بھی اسی خیال سے شروع ہوتا ہے ۔

" سمندر پھلانگ کر ہم نے جب میدان عبور کئے تو دیکھا کہ پگڈنڈیاں
ہاتھ کی انگلیوں کی طرح پہاڑوں پر پھیل گئی ہیں ۔میں ذرا رکا
اور ان پر نظر ڈالی جو بوجھل سر جھکائے ایک دوسرے کے
پیچھے چلے جارہے تھے میں بے پناہ اپنا ئیت کے احساس
سے لبریز ہوگیا تب علاحدگی کے بے نام جذبے نے ذہن میں ایک
کسک کی صورت اختیار کی اور میں انتہائی غمزدہ سر جھکائے

۱۔دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم ۔ (پوسٹر) ۔سریندر پرکاش جنوری / ۲۸ ۱۹ء

وادی میں اترگیا ۔" ۱ ۱ ۔۱

افسانہ اور آگے بڑھتا ہے اور کہانی کا کردار " میں " خود کو ایک نہایت ہی عالیشان ، خوبصورت اور تمام دیدہ زیب اشیأ کے وسیع ایک کمرہ میں خود کو اکیلا ، سہما ، اور متحیر سا پاتا ہے ، اسکا یہ خیال کہ اس ڈرائینگ میں وہ سب کچھ تو موجود ہے جسکی ایک انسان تمنا کرتا ہے ۔اسقدر دلکش کمرہ ، ایک اچھی بیوی اور مسکراتے کھیلتے بچے کا وجود ، ـــــ لیکن پھر بھی وہ اس شخص کو تلاش کرتا رہتا ہے جو اس گھر کا مالک ہے مگر نہ جانے کیوں بس وہی ایک شخص اسکو نظر آیا ۔وہ ایک شخص جو اس گھر کا یقیناً مالک ہے نہ جانے کہاں ہے ؟ طرح طرح کے خیالات اس شخص کے بارے میں افسانہ نگار کے ذہن میں ابھرتے رہے ۔وہ بھی ایک خوبصورت ، صحتمند ، چہرے پر پژار اطمینان اور مسکراہٹیں بکھیرے گھر کے کسی کونے میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ مگن ہوگا ؟ ؟ ؟ ـــــ ـــــ لیکن اخیر وقت تک وہ شخص سامنے نہ آسکا ! اگر کوئی اس گھر میں نظر بھی آیا تو ایک بوڑھا ، پریشان حال انسان ، یا ایک سانپ جسکو دیکھ کر دہشت ہوتی ہے ؟ ! ـــ وہ ایک انسان کون تھا ؟ جسکا انکشاف اخیر میں کردیا گیا ہے کہ وہ کوئی اور نہ تھا بلکہ وہ خود وہی شخص تھا جو اپنے ہی گھر میں غیروں کی طرح "ڈرائنگ روم " میں بیٹھا ایک ایسے انسان کا خواب دیکھ رہا تھا جو اسکے اندر نہ جانے کب کا مرچکا ہے ؟ ! ـــــ

"سب خوب ہے ، ہر چیز جاذب ہے ، تمام کچھ اپنانے کو جی چاہتا ہے ، کاش ! ! کاش ! یہ سب کچھ میرا ہوتا ؟ ! ۔یہ صوفہ ، کارنر ٹیبل پر پڑا ہوا گلدان ، بک کیس میں پڑی ہوئی کتابیں ، کارنس پر رکھی ہوئی تصویر ، گہرے سبز قالین کا گدگدا پن ، ـــــ

۱۔دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم ، سریندر پرکاش ۔ص ۲۳ ۔ ۱۹۶۸ ع

——— بیڈ روم میں مسکراتی عورت ، تتلیاں پکڑتی ہوئی بچی ،
اور ان تمام چیزوں کے اپنا ہونے کا ہمہ گیر ، بھر پور احساس !!
— مگر نہیں ! ——— میں نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے انکی طرف
دیکھا اور پوچھنا چاہا - دیکھ رہے ہو ؟ یہ سب دیکھ رہے ہونا ؟ —
ایکا ایکی میں نے اپنی بے چارگی پر قابو پایا اور بازو لہرا کر
کہنا چاہا !! ——— سنو ! تم سب سن لو ——— سمندر کنارے کے
شہر کا پتا ہے نا ؟ ! اگر کبھی کوئی کمزور ، نحیف بے سہارا
کشتی ساحل سے آ لگے ، تو سمجھ جانا کہ وہ میں ہوں !!! — "۱-

کہانی بس انہی جملوں کے ساتھ ختم ہوجاتی ہے اور آج کے انسان کا سب سے بڑا المیہ یعنی خود کو اجنبی محسوس کرنا ،، پڑھنے والوں کے ذہن پر مسلط کرجاتی ہے — اس افسانہ کا موضوع ہمارے آج کے ماحول اور معاشرہ کی دین ہے ، جس میں انسان اپنے اندر اپنی اس شخصیت کو دیکھنے سے قاصر رہتا ہے جسکا وہ متلاشی ہوتا ہے —

علامتی افسانے لکھنے والوں میں ایک اہم نام بلراج مین را کا ہے یوں تو انکی مجموعہ کی شکل میں ابھی تک کوئی باقاعدہ کتاب شائع نہیں ہوئی ہے لیکن
۱- ۱۹۶۶ء میں ان کے سات افسانوں کا انگریزی ترجمہ شائع ہوچکا ہے —
۲- ۱۹۷۲ء میں پنگون کے ادارے سے اور عادل جسا والا کی ادارات میں شائع ہونے والے مجموعہ "ہندوستان میں نئی تجربہ" میں بلراج مینرا کا افسانہ " ماچس" یا " وہ" بھی شامل ہے - اور مینرا ہی اردو کا وہ واحد افسانہ نگار ہے جسے اس

۱- دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم - سریندر پرکاش - ص ۳۲ - ۳۳ - ۱۹۶۸ء

۲- جواز - اردو افسانے کے بیس سالہ دور - باقر مہدی - ص ۲۱ - فروری / ۱۹۷۷ء

اردو کے رسالوں میں مین را کے افسانے بڑی تعداد میں شائع ہوچکے ہیں -

عصمت چغتائی نے بلراج مینرا کے قابل ذکر افسانہ نگار ہونے کے سلسلہ میں اپنا بیان کچھ اس طرح دیا ہے : -

" نئے ادیب بڑی شان سے پیدا ہورہے ہیں ، ایسا تو نہیں ہوسکتا کہ آج کوئی کہانی لکھے اور کل ادیب بن جائے ، بنتےبنتے سال بیت جاتے ہیں - ہندوستان میں جہاں کہا جاتا ہے کہ اردو کو اسکا حق نہیں ملا ، نئے ادیب ابھرے ہیں ———— علامتی ادب لکھنے والوں میں بھی ابھرے ہیں - بلراج مینرا نے اپنا مقام بنالیا ہے - " -۱

مینرا نے کوئی طویل افسانہ نہیں لکھا اور نہ ہی ناول یا ناولٹ لکھنے کی کوشش کی —— ان کے تمام تر افسانے مختصر اور کسی ایک خیال کے پیش نظر لکھے گئے ہیں - اور یہ خیال ان کی کہانیوں میں علامتی استعاروں اور کنائیوں کے ذریعہ ایک محدود کینوس پر پھیلتا گیا ہے - ان کی کہانیوں کے موضوعات ہمارے ملک میں رو نما ہونے والے عام رجحانات ہیں جن میں آج کا ہمارا ہر فرد گرفتار ہے - کبھی روزی روٹی کا مسئلہ ، کبھی خود کو پہچاننے کی کوشش اور کبھی عدم تحفظ اور ایک گہری اداس مایوسی ———— ان کی کہانیوں میں انسان کے کسی کرب کی ایک دبی ہوئی آواز چھپی ہوئی نظر آتی ہے جو کسی بھی لمحہ چیخ کر آسمانوں کا سینہ چاک کردینا چاہتی ہے ء اور یہ کرب کسی چڑچڑی طبیعت پر مسلط ، نفی پسندی ، بے معنویت ، ماویت ، دہریت ، کھوکھلے پن کا احساس ، جمود ، کنفیوزن ، بے اعتقادی اور معاشرہ کے شکستہ ڈھانچہ میں مسلسل ناکامی کے احساس سے پیدا ہوگیا ہے - ان کی صرف ایک کہانی وہ (ماچس) کو علامتی افسانوں میں نمایاں طور پر دیکھا جاتا ہے - اس کے علاوہ بھی انھوں نے اور افسانے لکھے مثلاً مقتل ، ظلمت ، ریپ ، کمپوزیشن ایک ، اور کمپوزیشن دو جو ۱۹۷۵ء ،

۱- شعور - چھلاوا - ص ۲۹۰ - مارچ ۱۹۷۸ء

۱۹۲۳ء ، ۱۹۲۴ء ، ۱۹۲۵ء میں لکھے گئے ۔ لیکن ان کے باوجود اب بھی جب کبھی بلراج مہرا کے افسانوی اسلوب یا کسی خاص موضوع کا ذکر ہوتا ہے تو بحث "وہ" میں سے شروع ہوتی ہے — اور اس طرح قاری پر افسانہ کے وہ تمام رموز اور ان کہی باتیں بے ربط الفاظ ، اور بے ہنگم سے خیالات کا مجموعہ ہوتیں ہیں لیکن ان کو غور سے پڑھنے پر موضوع کی ترتیب اور خیالات کا ایک ایسا سلسلہ بند ہوجاتا ہے کہ ذہین قاری اپنا ہی کوئی دبا ہوا احساس ان کہانیوں میں ڈھونڈھ نکالتا ہے — انکی کہانی وہ (ماچس) بھی ایسے ہی موضوع کے پیش نظر لکھی گئی ہے کہ بسا اوقات انسان اپنی کسی ذرا سی خواہش کی تکمیل کے خاطر ایک کبھی نہ ختم ہونے والی مایوسیوں کا شکار بن جاتا ہے اور وہ خواہش ، پھر بھی تشنہ تکمیل رہتی ہے ۔ایسی ہی نہ جانے کتنی عام انسانی خواہش ہوتی ہیں جو لاکھ جتن کے باوجود کار گر ثابت نہیں ہو پاتیں اور نتیجہ ، مایوسی ، ناکامی ، پریشانی اور خوامخواہ کی ذلت !! ——— " وہ" میں افسانہ نگار " سگریٹ" کو مرکزی کردار کی شخصیت کا اصلی پیکر بناکر پیش کیا ہے جس کے سلگنے ہی میں اس کردار کے وجود کی حقیقت پوشیدہ ہے ۔لیکن اس حقیقت کو کارگر ہونے کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی ایسا نہ ہونا صرف اس وجہ سے ہے کہ اس کے گرد ہر چہار طرف جمود ، خاموشی ، سرد مہری ، اور اجنبیت پھیلی ہوئی ہے ، وہ حرارت یا روشنی کا متلاشی ہے کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ حرارت یا روشنی کا حصول اسکی خواہش کی تکمیل ہے مگر لاکھ سعی کے باوجود وہ ناکام رہتا ہے — یہ ناکامی آج کے معاشرہ میں کسی ایک فرد کا مسئلہ نہیں بلکہ تمام معاشرہ اپنے گرد اجنبیت ، اور جمود کو پاتا ہے ۔جسکا اظہار افسانہ میں بھی کردیا گیا ہے کہ جب " وہ" یعنی کہانی کا کردار ، پولیس اسٹیشن سے ناکام واپس پورہا ہوتا ہے تو اس وقت وہ راستہ میں ایک ایسے ہی شخص کو پاتا ہے جس کے منہ میں بھی ایک بجھی ہوئی سگریٹ لگی ہوئی اور

وہ بھی روشنی ، یا ماچس کی متلاشی میں ہے -

" سامنے سے کوئی آرہا تھا اور اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے

وہ اس کے قریب آکر رکا ! ـــــ

اس کے لبوں میں سگریٹ کانپ رہا تھا !

آپ کے پاس ماچس ہے ؟ ! ـــ

ماچس ؟ !

آپ کے پاس ماچس نہیں ہے ؟ !

ماچس کے لئے تو میں ..... ،،

وہ اسکی بات سنے بنا ہی آگے بڑھ گیا -

آگے ، جدھر سے وہ خود آیا تھا -

اس نے قدم بڑھایا

آگے جدھر سے وہ آیا تھا !! ـــــ" ۱-

اور اس طرح روشنی کا یہ متلاشی قانون کی زد سے نکل کر ناکام آگے قدم بڑھا دیتا ہے ـــ

اس افسانے کی سب سے بڑی خوبی ماچس اور روشنی کا خوبصورت استعمال ہے - آج کا نیا انسان کس طرح روشنی کی تلاش میں سرگرداں ہے اور اسکی اس لگن کو اس وقت کے نظام قانون سے ٹکرانے کا ملزم قرار دیتی ہے ـــــــــ تمام افسانہ اسی خیال کی نمائندگی کرتا ہے ـــــــــــ

میرا نش نسل کے ان افسانہ نگاروں میں ہیں جنھوں نے چند افسانوں کے ذریعہ نئے اردو افسانہ نگاروں میں اہم مقام حاصل کرلیا ہے -

ـــــــ xxxx ـــــــ

۱- عصری ادب - منتخب افسانے - بلراج مینرا - ص ۲۲۸ - ۱۹۷۰ - ادارۂ تصنیف ، دہلی -

اس باب کے ختم ہونے کے ساتھ ساتھ تقسیم ہند کے بعد اردو افسانے کے موضوعات کا جائزہ مکمل ہوجاتا ہے ۔ اردو افسانہ تقسیم ہند کے بعد سے اب تک طرح طرح کے تجربات سے گزرا ہے ۔ افسانہ نگاروں کے نئے نئے نام افسانے کی دنیا میں آئے ہیں ان سب نے زندگی کی تبدیلیوں کا بڑی خوبی سے جائزہ لیا ۔ بدلتی ہوئی سماجی معاشی قدروں پر غور کیا اور پھر اسے اپنے منفرد تجربات کے ذریعہ اپنے لب و لہجہ میں افسانے میں پیش کیا ـــــ ـــــ افسانے میں پلاٹ و کینوس وسیع ہوتا گیا اور الفاظ کم ہوتے گئے ۔ طویل افسانے نے مختصر افسانہ کی جگہ لے لی ـــــ افسانہ نگار کی توجہ اس بات پر مرکوز ہوگئی کہ وہ اپنے پورے سماج ، تمام معاشرے ، ملکی اور غیر ملکی حالات کو کم سے کم الفاظ میں بیان کردے ۔ تقسیم ہند کے بعد ایک مدت تک تو افسانہ نگاروں کے قلم تقسیم کے المیہ کے دکھ درد ، گھٹن اور چبھن کو دہراتے رہے ـــــ اس کے بعد انکا یہ غم بھی وقت کے ساتھ ساتھ ہلکا پڑا ـــــ اب افسانہ نگاروں کے سامنے نئے موضوعات کی کمی نہ تھی ۔ جاگیردارانہ نظام اپنی شان و شوکت کھو رہا تھا ۔ دیہاتی کسان بیدار ہو رہا تھا ۔ ملک ترقی کی طرف تیزی سے گامزن تھا ۔ انسانی زندگی تیزی سے بدل رہی تھی انسان کی مصروفیات دن بدن بڑھ رہی تھیں ـــــ افسانہ نگار اس بدلتی ہوئی صورت حال سے متاثر ہوکر افسانے لکھ رہے تھے ـــــ وہ افسانہ نگار جنھوں نے افسانہ نگاری میں پہلے سے مقبولیت حاصل کرلی تھی انکے انداز بیان میں تبدیلی ہوئی ۔

اس پورے افسانوی جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ افسانوی ادب نے کتنی خوبی سے تقسیم کے المیہ کے موضوع سے لیکر موجودہ صورت حال تک کس طرح مختلف موضوعات کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے ـــــ اس جائزے سے اگر افسانوی موضوعات کی خوبصورت ادائگی ، زبان کا حسن ، پلاٹ کی وسعت ، انداز بیان کی لطافت ، کردار نگاری کا سلیقہ ۔

تکنک کی کامیابی سامنے آئی تو ساتھ ہی علامتی تجریدی افسانوں کی پیچیدگیوں نے افسانے کی تکنیک کے نئے مسائل کی طرف توجہ دلائی ہے - مگر یہ بحث اس مقالہ کے دائرے سے خارج تھی - اس لئے یہاں اس کی تفصیلات پر بحث نہیں کی گئی - صرف موضوعات کے حوالے سے اس کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے - علامات کو سمجھے بغیر افسانے کی خوبی کا تعین ممکن نہیں اور شاید اسی لئے بیشتر علامتی افسانے نظر انداز ہوئے ہیں - ان علامتی افسانہ نگاروں کے یہاں " میں " کی آواز اتنی اونچی ہوتی ہے کہ نہ تو کردار نگاری کے جوہر کھل پاتے ہیں اور نہ ہی کہانی پن کی رفتار میں روانی پیدا ہوپاتی ہے - ایسے افسانوں اور افسانہ نگاروں کا ذکر بھی اس جائزے میں کیا گیا ہے - افسانوں کے موضوعات کے جائزے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس پورے عرصہ میں کچھ موضوعات ایسے ہیں جو کسی نہ کسی صورت میں افسانہ نگاروں کی توجہ کا مرکز رہے ہیں ——————

جنس - انسان دوستی - گھریلو معاشرہ کی عکاسی - انسانی زندگی کی چھوٹی چھوٹی مسرتیں - انسان کی دو رخی شخصیت - شہری زندگی کی پیچیدگیاں - صنعتی نظام میں تبدیلی - مغربی معاشرہ کا اثر ہندوستانی سماج پر - اقتصادی پریشانیاں - روزگار کا مسئلہ لوگوں کا گاؤں سے شہر کی طرف رجوع —— ازدواجی —— نا آسودگیاں - شہری انسان کی بڑھتی ہوئی ضرورتیں —— جاگیردارانہ تہذیب کا زوال ——————

اس پورے عرصہ میں یہ موضوعات اردو افسانے کا مرکز رہے ہیں ——

—————— xxxx ——————

کتابیات

افسانوں کے مجموعے :-

۱۔ احمد عباس (خواجہ)	نئی دھرتی نئے انسان ۔ مکتبہ جامعہ ، نئی دہلی ۔	۱۹۷۷ء
۲۔ اقبال مجید	دو بھیگے ہوئے لوگ ، نامی پریس ، لکھنئو ۔	
۳۔ اقبال متین	خالی پٹاریوں کا مداری ، نامی پریس لکھنئو ۔	۱۹۷۷ء
۴۔ اطہر پرویز (ڈاکٹر)	منٹو کے نمائندہ افسانے ، اسرار کریمی پریس ۔ الہ آباد ۔	۱۹۷۷ء
۵۔ اطہر پرویز (ڈاکٹر)	اردو کے تیرہ افسانے اسرار کریمی پریس ، الہ آباد ۔	۱۹۷۲ء
۶۔ احراز نقوی (ڈاکٹر)	۶۳ ۱۹ء کے منتخب افسانے پاکستان ٹائمز پریس ۔ لاہور ۔	۱۹۶۳ء
۷۔ پرکاش پنڈت	اردو کے بہترین افسانے ۔ یونین پرنٹنگ پریس ۔ دہلی ۔	
۸۔ جوگیندر پال	لیکن ۔ نظامی پریس ، لکھنئو ۔	۱۹۷۷ء
۹۔ جوگیندر پال	سلوٹیں ۔ لاجپت رائے اینڈ سنز ۔ دہلی ۔	۱۹۷۵ء
۱۰۔ حیات اللہ انصاری	شکستہ کنگورے ۔ یونین پرنٹنگ پریس ، دہلی ۔	۱۹۵۶ء
۱۱۔ راجندر سنگھ بیدی	اپنے دکھ مجھے دیدو ۔ مکتبہ جامعہ ۔ دہلی ۔	۱۹۷۵ء

۱۲۔ رتن سنگھ	پنجرے کا آدمی - نامی پریس، لکھنئو - ۱۹۷۳ء
۱۳۔ رتن سنگھ	پہلی آواز - نظامی پریس، لکھنئو - ۱۹۵۹ء
۱۴۔ رام لال	چراغوں کا سفر
۱۵۔ رام لال	گزرتے لمحوں کی چاپ
۱۶۔ سریندر پرکاش	دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم، اسرار کریمی پریس، الہ آباد
۱۷۔ عصمت چغتائی	چھوٹی موٹی - او ور سیز بک سینٹر، بمبئی -
۱۸۔ عصمت چغتائی	کلیاں - آزاد کتاب گھر، کلاں محل، دہلی - ۱۹۶۳ء
۱۹۔ عصمت چغتائی	چوٹیں - پیام وطن پریس، دہلی - ۱۹۶۰ء
۲۰۔ عبدالستار (قاضی)	پیتل کا گھنٹہ -
۲۱۔ غیاث احمد گدیؔ	بابا لوگ - پٹنہ لیتھو پریس - گیا ۱۹۶۹ء
۲۲۔ غیاث احمد گدی	پرندہ پکڑنے والی گاڑی - اسرار کریمی پریس - الہ آباد - ۱۹۷۷ء
۲۳۔ قرۃ العین حیدر	پت جھڑ کی آواز - مکتبہ جامعہ، دہلی - ۱۹۷۵ء
۲۴۔ کرشن چندر	ان داتا - راجیو پرکاشن، نئی دہلی -
۲۵۔ کرشن چندر	کتاب کا کفن بیسویں صدی بک ڈپو - دہلی - ۱۹۶۱ء
۲۶۔ کرشن چندر	یوکلپٹس کی ڈالی - دلی پرنٹنگ پریس - ۱۹۵۹ء
۲۷۔ کرشن چندر	زندگی کے موڑ پر - الجمعیت پریس، دہلی - ۱۹۷۷ء
۲۸۔ واجدہ تبسم	اترن - او ور سیز بک سینٹر - بمبئی - ۱۹۷۷ء
۲۹۔ واجدہ تبسم	نتھ کا بوجھ - او ور سیز بک سینٹر، بمبئی - ۱۹۷۷ء
۳۰۔ واجدہ تبسم	شہر ممنوع، نیا ادارہ سویرا آرٹ پریس، لاہور -

تنقیدی کتابیں:-

۳۱ آل احمد سرور (مرتبہ) — جدیدیت اور اردو ادب

۳۲ احتشام حسین — اعتبار نظر - سرفراز قومی پریس- — ۱۹۶۵ء

۳۳ قمر رئیس (ڈاکٹر) — تنقیدی تناظر - نعمانی پریس ، دہلی- — ۱۹۷۸ء

۳۴ محمد حسن (ڈاکٹر) — ادبی تنقید سرفراز قومی پریس -ناد ان محل روڈ ،لکھنئو- — ۱۹۵۴ء

۳۵ محمد حسن (ڈاکٹر) — جدید اردو ادب - مکتبہ جامعہ - جامعہ نگر -نئی دہلی- — ۱۹۷۵

۳۶ مجتبیٰ حسین — ادب و آگہی -ریلیکا پرنٹنگ پریس ، کراچی-

۳۷ وقار عظیم — نیا افسانہ -ایجو کیشنل بک ہاؤس ، علی گڑھ-

۳۸ وقار عظیم — داستان سے افسانے تک جمال پرنٹنگ پریس ، جامع مسجد -دہلی- — ۱۹۷۲ء

رسائل:-

۳۹- تحریک — سلور جوبلی نمبر - جولائی ، اگست ، ستمبر ، اکتوبر - ۱۹۷۸ء

۴۰- جواز — مدیر -سید عارف -فروری ، مارچ ، اپریل - ۱۹۷۷ء

۴۱- روپی منٹو نمبر — ستمبر - ۱۹۷۷ء -دہلی

۴۲- شاعر — ہم عصر اردو ادب نمبر - بمبئی- — ۱۹۷۷ء

۲۲- شعور - ترتیب مین را - مارچ / ۱۹۷۸ء

۲۳- عصری ادب - نگران ، محمد حسن دسمبر / ۱۹۷۰ء

۲۵- نقوش - افسانہ نمبر -جلد اول ، دوم-
ادارۂ فروغ اردو ، لاہور -

xxxxx